اقبالیات

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کشمیر

اِقبالیات

13

مرتبہ

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

(جملہ حقوق بحقِ انسٹی ٹیوٹ محفوظ ہیں)

نام اقبالیات

مرتّب ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

اشاعت جنوری ۲۰۰۱ء

تعداد ۵۰۰

قیمت ۴۰ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ ضمیر احمد

مطبع شالیمار آرٹ پریس سری نگر

ملنے کا پتہ:

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نسیم باغ حضرت بل سرینگر

فہرست

موضوعات	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱۔ پیش گفتار	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی	۱
۲۔ اقبال اور تصوّف	جسٹس علی محمد میر	۴
۳۔ قاضی صاحب چند معاصرین کی نظر میں	پروفیسر غلام محمد شاد	۱۸
۴۔ اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت	غلام رسول آزاد	۳۲
۵۔ اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت	شکیل شفائی	۵۷
۶۔ اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت	غلام محمد خان	۷۳
۷۔ اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت	حسن زینہ گیری	۱۱۵
۸۔ مناظر فطرت اور اقبال	ڈاکٹر صورت جہاں	۱۴۴

پیشِ گفتار

مجلّہ "اقبالیات" کا تیرھواں شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اقبالیات کا دائرہ اور مطالعہ آئے دن بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ اس موضوع کے ساتھ طلبہ، اساتذہ، عوام اور خواص کی دلچسپی میں اضافہ ہورہا ہے۔ چنانچہ اس امر کی شدت سے ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ اقبال اور اقبالیاتی ادب کی زبان سہل، عام فہم اور روزمرہ ہو، تاکہ عام لوگ کلامِ اقبال کی رنگارنگیوں اور لطافتوں سے محظوظ ہوں۔ موجودہ پُر آشوب عہد میں پیغامِ اقبال کی افادیت بڑھتی جارہی ہے۔ کیونکہ ہمارا معاشرہ قدروں سے خالی ہوتا جارہا ہے۔ انسانیت دم توڑ رہی ہے۔ احترامِ آدمیت کا قانون پامال ہوتا جارہا ہے اور ہر طرف افراتفری، بے اعتمادی اور بے مروتی کے نظارے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اقبال اس تاریکی اور تیرگی کی صورتحال میں انسان دوستی اور محبت انسانی کا فانوس روشن کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ وہ ماضی کی شاندار روایات سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کو سنوارنے کی آرزو پیدا کرتا ہے۔ وہ بکھرے دانوں کو

ایک مالا میں پرونے اور انکی خوشنما شیرازہ بندی کا داعی ہے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام سے گذشتہ سال مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا تھا۔ مقابلے کیلئے "اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت" موضوع مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ نژادِ نو سے تعلق رکھنے والے کئی ادیبوں نے مضامین لکھے اور ایک سہ نفری کمیٹی نے تین بہترین مضمون نگاروں کے حق میں نقد انعامات دینے سے اتفاق کرتے ہوئے جناب شکیل شفائی، جناب غلام رسول آزاد اور جناب غلام محمد خان کو بالترتیب تین انعامات سے نوازا۔ ان مضامین کو اسی ایک عنوان کے تحت زیر نظر شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔ مضمون نگاروں نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا یا نہیں، اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ اس شمارے میں ریاستی ہائی کورٹ کے ایک سینئر جج آنریبل جسٹس علی محمد میر کا مقالہ جو تصوف کے پیچیدہ موضوع سے متعلق ہے، شامل ہے۔ میر صاحب معروف مقنن اور قاضیٔ عدالت ہونے کے ساتھ ساتھ شروع سے علم و ادب کے شیدائی رہے ہیں۔ اقبال اور تصوف کے موضوع پر ان کے رشحاتِ قلم سے ان کی ادبی بصیرت اور فکری گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ عدالتِ عالیہ میں مقدموں کی شنوائی کے دوران بھی غالب، اقبال، فیض، شہریار، رسل میر، وہب کھار اور محمود گامی کے متعدد اشعار پڑھ کر انصاف کے طلبگاروں پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی یاد اور اہمیت واضح کرتے ہیں۔

اس شمارے میں یونیورسٹی کے ایک مقبول و معروف ریاضی دان اور شاعر پروفیسر قاضی غلام محمد مرحوم پر پروفیسر شاد صاحب کا ایک مدلل مضمون بھی شامل ہے۔ یہ مضمون شاد صاحب نے اس دو روزہ سمینار میں پڑھا تھا جو ۵ اور ۶ جولائی

۲۰۰۰ء کو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا تھا اور جس میں کافی تعداد میں ادباء اور شعرا نے شرکت کی تھی۔

مجلۂ "اقبالیات" میں نئے تخلیق کاروں، اقبال شناسوں اور ادیبوں کے فکر و نظر کو بھرپور جگہ دینے کی مکمل گنجائش ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ ریاست اور ملک کے تمام اقبال شناسوں سے ملتمس ہے کہ وہ اپنی تخلیقات، منظومات اور مضامین کو رسالۂ اقبالیات میں چھپوائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ عاشقانِ اقبال ان تخلیقات سے مستفید ہوں۔ ادارے کو رسالہ خوب صورت بنانے، اسکا معیار بلند کرنے اور اس میں نئی جہتیں پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے قارئین کی تجاویز و آرا کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

اقبال اور تصوف

جسٹس علی محمد میر

تصوف وہ جنسِ نایاب ہے۔ جس کی اصلیت کو تعبیرات اور تاویلات کی یلغار نے مسخ کر دیا ہے۔ آج کل کا بازاری تصوف ایک دکان یا ذریعہ معاش ہے جہاں ہزاروں صوفی سر بہ جیب ہیں اور خال ہی کوئی بندۂ خدا نظر آئے گا جو تصوف کو بطورِ ذریعہ معاش استعمال نہ کرتا ہو۔ اسلام کا ہر طالب علم اس خانہ زاد صنف تصوف سے یکسر نفرت کرنے لگتا ہے۔ جب اسلام اور تصوف میں اسے یگانگت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔

عام طور پر اس نمایاں تضاد کے دو وجوہ پیش کئے گئے ہیں۔ اول یہ کہ اسلام کا پودا، جس کی پیدایش سر زمین عرب کی کردار و عمل والی آب و ہوا میں ہوئی، اپنی اصل شکل میں عجم کی فضاء میں جو اس کردار و عمل کی متحمل نہ تھی۔ تناور نہ ہو سکا۔ دوم یہ کہ ہر نظریۂ فکر و عمل کی طرح اسلام کو بھی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ

ارتفاعِ معکوس کا شکار ہونا پڑا۔ ان دو وجوہ کی بنیاد پر کردار کی جگہ گفتار نے لے لی اور حال کی جگہ قال کا چرچا ہونے لگا۔ اسلام کی جگہ ایک منفرد چیز وجود میں آگئی جس کا نام تصوف رکھا گیا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اسباب کیا تھے۔ ہمیں اولاً تصوف کی اصل حقیقت کو متعین کرنا ہوگا۔

خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے وصال کے بعد، خلیفہ وقت حضرت عمر فاروقؓ نے ازراہِ تجسس مرحوم کی رفیقہ حیات سے سوال کیا کہ مرحومؓ کی شبینہ عبادت کا کیا طریقہ ہوتا تھا۔ محترمہؓ نے جواب میں عرض کیا۔

"حضرت صدیق اکبرؓ، اکثر راتیں عبادت الٰہی میں گزارا کرتے۔ نفلی نمازوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ نماز کی چند رکعتیں پڑھ کر چہار زانو بیٹھا کرتے اور گہرے غور و فکر میں ڈوب جاتے۔ اکثر روتے۔ اس حالت میں کافی دیر تک رہ کر ایک لمبی آہ بھرتے۔ اس وقت ان کے منہ سے کلیجی کے جلنے کی بُو آجاتی۔ پھر کھڑا ہو کر نماز ادا کرتے۔ اور پھر اسی طرح فکر و استغراق میں ڈوب جاتے۔ وقفے وقفے پر پھر وہی آہیں بھرتے۔ وہی بو۔ یہی سلسلہ ساری رات جاری رہتا۔"

دن بھر حضرت صدیق اکبرؓ کا کام کس طرح کا ہوتا تھا۔ تاریخ اسلام کے دفتروں کے دفتر اس موضوع سے بھرے پڑے ہیں۔ بہر حال یہ کہنا کافی ہوگا کہ دن کا ہر لمحہ دعوتِ دین، تعمیر ملت اور امور سلطنت میں گذرتا۔ اور اس سب کوشش مسلسل کا مدعا فقط رضائے حضرت اللہ ہوتا۔

بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ قرآن و اُسوۂ حسنہ کے خطوط پر حضورِ اکرم ﷺ کی سرپرستی میں ترتیب دیا ہوا وہ انسانی شاہکار جسے تصوف کے مثالی نمونہ پیش

کرنے کی سعادت حاصل ہوئی وہ خود خلیفہ اولؓ تھے۔ ان کے روزینہ سعی پیہم اور عمل مسلسل کو ان کے شبینہ ذکر و فکر کے استغراق کے آئینے میں دیکھئے تو آپ کو تصوف کا ایک پیکر انسانی سامنے نظر آئے گا۔ یہ مسلک خلفاء راشدین، صحابہ کبار، ائمہ عظام اور اولیاء کرام کے ہاتھوں سے پروان چڑھا۔

اقبال ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اسلام اور تصوف دونوں کو سمجھ لیا تھا۔ وہ تصوف کے دعویدار وارث، صوفی، اور تصوف کے حریف ملاّ دونوں سے نالاں ہیں کیونکہ دونوں نے غلط تاویلات سے تصوف کا حلیہ بگاڑ دیا۔

زمن بر صوفی و ملاّ سلامے
کہ احکام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفٰے را

حکیم ملت چونکہ ایک آفاقی دعوتِ عمل کے حامل تھے۔ اس لئے تصوف کے مضمون پر ان سے ایک مدلل اور سیر حاصل تفسیر کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاہم ان کے فکر انگیز کلام میں اگر کسی مسلک کی چھاپ سر تا پا نظر آتی ہے۔ وہ ہے تصوف، اس کے باوجود اقبال نے تصوف کے عنوان سے جو قطعہ تحریر کیا وہ اختصار کے باوجود جامع اور واضح ہے۔

یہ حکمت ملکوتی، یہ عالم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکرِ نیم شبی ، یہ مراقبے یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالہٰ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بظاہر، قطعے کا ہر مصرعہ ثانی منفی عبارت میں پہنائے ہوئے لباس کی وجہ سے مراقبے،ذکرو فکراور علم وخرد کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن ہر نفی ایک ایک شرط کے ساتھ اثبات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک اسلوب بیان ہے جو اقبال کا خاصہ ہے۔ علم و خرد جب تک گداگروں کی طرح اپنی جبیں بارگاہِ عشق کی دہلیز پر نہ رکھیں کسی بلندی یا ترقی کا ضامن نہیں ہو سکتے۔ عشق کا علاقہ چنانچہ صرف دل سے ہے اس لئے علم اور عقل دونوں کو دل پر وارد ہونا چاہئے۔ ورنہ علم حجاب اکبر اور عقل دردنِ خانہ ہنگاموں سے بے خبر، سرگردان اور بھٹکتا پھرے گی، عین اسی طرح ذکرو مراقبے کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہونا چاہئے اگر ایسا نہیں تو خالی ذکرو مراقبہ ایک جسمانی اور زبانی حرکت ہے جس سے روح کو کسی قسم کا فائدہ نہیں۔

آخر آیہ کہ صفات لاہوتی و ملکوتی کو اگر اس مقصد کیلئے استعمال نہ کیا گیا جس عمل کے ساتھ ان صفات کا وجود وابستہ ہے یعنی تعمیر ملت، تو یہ ذکرو مراقبے رہبانیت کے علاوہ کچھ نہیں۔

ذکرو مراقبے اور علم و خرد بذات خود راہِ مغفرت کا آغاز کرتے ہیں۔ اقبال نے

ذکر و فکر کو انسانی روح کی صحت کا ضامن ٹھہرایا ہے۔

حفظِ تن ہا ضبط نفس اندر شباب
حفظِ جا نہا ذکر و فکر بے حساب

اسی طرح اقبال نے عقل کو گھر کے باہر رکھے ہوئے ایک چراغ کا درجہ دیا ہے۔ یہ چراغ شورش درون خانہ سے بے خبر ہے۔ جب تک عقل کا رشتہ دل سے قایم نہ ہو جاتا عقل تماشہ بین کی طرح درون خانہ ہنگاموں سے نابلد پھٹکتی رہتی ہے۔

خرد کیا ہے؟ چراغ رہ گذر ہے
خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟
چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے؟

خود خرد کی ماہیت سے اقبال کو انکار نہیں، چراغ رہ گذر کا درجہ بذاتِ خود خرد کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کی شرح میں یہ کہنا کہ اس سے سفر کی تاریک راہیں منور ہو جاتی ہیں خرد کی اہمیت کو واضح کر دیتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن پاک کی تفہیم کیلئے عقل و علم کو سب سے بڑا وسیلہ قرار دیا ہے۔ ان کو شکایت ہے کہ قرآن کو سمجھنے کیلئے دوسرے علوم کا استعمال کیا جاتا ہے اور خارجی توجیہات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ان کے سامنے قرآن ہر جگہ عقل سلیم سے سوال کرتا ہے۔ اس لئے آزاد کے پاس عقل کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعۂ قرآن فہمی نہیں۔ یہاں ہم اسی موضوع کو زیادہ طول نہیں دینگے۔ مقصد صرف عقل کی ماہیت کا ہے۔ اقبال کو معلوم ہے کہ عقل اور علم، ذریعہ ہیں ایک

حقیقت تک پہنچنے کا۔

عقل اور علم اپنے اندر منزلیں نہیں۔ اگر انہیں منزل کے نقیب کے طور پر استعمال کرنا ہے تو اس کا وار دل پر ہونا چاہئے۔ ورنہ دونوں بحث و مباحثے کیلئے کشادہ جنگی میدان فراہم کرنے کے علاوہ ملت یا عالم انسانیت کیلئے کوئی فیض میسر نہیں کرتے۔

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
تو مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

علم و خرد اور ذکر و فکر وہ شمشیریں ہیں جن کو دل کے فساں پر جگر داری کا شرف حاصل ہو سکتا ہے۔ ورنہ وہ لوہے کے ٹکڑے ہیں، جن کو آلۂ حرب و ضرب کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ علم جاننے کا نام ہے اور پہچاننا "جاننے" سے مختلف ہوتا ہے۔

قرآن نے 'پہچاننے' کیلئے لفظِ "عرف" کا استعمال کیا ہے اور اسی لغت سے 'معرفت' کی اصطلاح وضع ہو گئی ہے۔ معرفت کی منزل علم کے بعد آجاتی ہے۔ من عرف نفسه فقد عرف ربه سے اس سفر معرفت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اقبال اول اول عام آدمیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کو کبھی زمین پر اور کبھی آسمانوں پر ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ حادثاتی طور ایک انکشاف کرتے ہیں کہ محبوب خود ان کے اندر موجود

ہے۔اس انکشاف سے نہ صرف اقبال کو محبوب کا ایڈریس ملتا ہے بلکہ اس پر پُرانی حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکان نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

اقبال سفرِ تصوف میں ایمان کو منزل کا پتہ ملنے کے بعد اہم ترین سنگِ میل سمجھتے ہیں۔یقین محکم کے ساتھ عملِ پیہم اور پھر ان فاتحانِ عالم کی پیروی جن کے دم سے سفینہ پار ہو چکا ہے۔اقبال کیلئے معرکۂ زندگی سر کرنے کیلئے کافی ہیں۔اقبال کا ایمان ہے کہ نارِ نمرود کو اس وقت گلزار کیا جاسکتا ہے۔جب ایمانِ خلیل پیدا ہو جائے۔

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

میدانِ عمل میں کودنے کے بعد اقبال خودی، فقر اور غیرت کے ہتھیاروں سے مومن کو لیس کرنا چاہتے ہیں۔یہ تینوں اصطلاحیں انسانی کردار کی کمال ترین پختگی کی ضامن ہیں۔اور ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتی ہیں۔

فقیری رمز پنہانی خودی کی — فقیری نامسلمانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتادوں — غریبی میں نگہبانی خودی کی

دوسری جگہ فقیری اور غیرت کے باہم تعلق کو یوں بیان کیا ہے

غربت ہے طریقت حقیقی　　غربت سے ہے فقر کی تمامی

مولانا جلال الدین رومی نے کھانے، شہوت جنسی اور طلب جاہ کو نقد روحانیت پر ڈاکہ ڈالنے والے ڈاکو کا نام دیا ہے۔ انہوں نے یہ مضمون ایک مختصر سی کہانی میں پیش کیا۔ ایک مسافر دور دراز جنگل میں سے گذر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بطخ، ایک مرغا اور ایک مور تھا۔ تھکے مسافر کی آنکھ لگ گئی۔ پرندوں نے اس کی آنکھ لگتے ہی پوٹلی میں سے پڑا ہوا دانہ چگ لیا۔ مسافر کی آنکھ کھل گئی تو لٹ گیا تھا۔ مولانا روم نے بطخ کو کھانے پینے، مرغے کو جنسیت اور مور کو جاہ پسندی کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔

اقبال فطرتاً سلیم الطبع اور شریف النفس تھے۔ انہوں نے بڑی شائستہ زبان میں خورد و نوش، جاہ پسندی اور جبلت جنسی کو روحانیت کا دشمن قرار دیا ہے۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ!
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

اسی طرح شہوت کے مضمون کو بھی شریفانہ انداز میں اس نظم میں ادا کیا ہے جس کا عنوان شاہین ہے۔

نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیمارئ نغمۂ عاشقانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

خورد و نوش کے معاملے میں اسلام کا نظریہ بڑا سیدھا سادہ ہے۔ رزق، اس

قوت لایموت کا نام ہے جو جسم و جان کے باہمی تعاون کو بحال رکھنے کیلئے ضروری ہو۔ وہ اس جہاں سے بیزار ہیں جہاں رزق کو خورد و نوش کے سامان کی فراوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کیا میں نے اس خاک داں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

وہ نانِ شعیر کو قوت بازوئے حیدری کیلئے شرطِ لازم اور فاقہ مستی و ژندہ پوشی کو مسلمانی کی شان سمجھتے تھے۔

مسلمان فاقہ مست و ژندہ پوش است
زکارش جبرئیل اندر خروش است
بیا تا نقش ایں ملت بسازیم
کہ ایں ملّت جہاں را باردوش است

مکان کے بارے میں بھی وہی شانِ درویشی اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ مکان بقدر ضرورت۔ اقبال کا مردِ مومن شاہین کی طرح فکرِ آشیان سازی سے بے نیاز ہے۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

دوسری جگہ قصر سلطانی کو حقارت کی نظر سے دیکھ کر پہاڑوں کی چٹانوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں،

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال مرمر کی سلوں سے بیزار ہیں۔ وہ مکان چاہیں گے بھی تو بقدر ضرورت

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنادو

روٹی، کپڑا اور مکان ۔۔۔ آج کے انسان کو وہ نعرہ ہے جو اس کی بنیادی ضروریات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اقبال کا نظریہ ان بنیادی ضرورتوں کے بارے میں کسقدر درویشانہ ہے۔ کلامِ اقبال سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ فقر، خودی اور غربت کی بٹھی میں مسِ خام کو کندن بناتے ہیں۔ اور یہی تصوف کا بنیادی مدعا ہے۔ وہ دنیا سے نفرت اور آخرت سے پیار کرتا ہے حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے تحت وہ دنیا کو مردہ لاش اور اس کے طالب کو کتا تصور کرتا ہے۔ اس لئے ماسوا اللہ سے ناطہ توڑ کر اللہ سے تعلق جوڑتا ہے۔ تصوف میں پہلی صورتحال کو 'لا' اور دوسری کیفیت کو 'الا' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دو اصطلاحیں نصابِ تصوف کو مکمل کرتی ہیں۔

قلندر جز دو حرفِ لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

اقبال 'لا' کو مومن کی زندگی کی ابتدا اور 'الا' اس کی انتہا سمجھتے ہیں۔ 'لا' اور 'الا' کے درمیان جتنی مسافت ہے، اس کو ان صفات کی بدولت سر کیا جاسکتا ہے۔ جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ یہ صفات اللہ تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔

نہادِ زندگی میں ابتدا 'لا' انتہا 'الا'
پیامِ موت ہے، جو لا ہوا اِلّا سے بیگانہ

اقبال اللہ کو پانے کی خاطر نہ صرف دنیا سے ناطہ توڑنا چاہتے ہیں بلکہ عقبیٰ سے بھی۔

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

وہ عبادت میں خلوص چاہتے ہیں پر تمنائے حور و قصور سے عبادت میں بساطی پن کی بو آتی ہے۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

یہ تصوف کا کلیدی فلسفہ ہے۔ تصوف میں "اللہ بس باقی ہُو" کے مختصر سے فارمولہ میں فلسفۂ ترک ماسوا اللہ کو قلمبند کیا گیا ہے۔ عین اسی وجہ سے اقبال جنت کو زاہدوں کی منزل آخر سمجھتے تھے۔ جس کی طرف عارف باللہ کو کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ وہ چاہتا ہے تو فقط دیدارِ خدا۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
میں بس آپ کا سامنا چاہتا ہوں

خودی، فقر اور غیرت کے علاوہ اخلاص بھی ایک نہایت ضروری ہتھیار ہے، جو مومن کو بارگاہِ خداوندی میں پیش ہونے کے قابل بناتا ہے۔ اللہ کے جناب میں حاضری دینا تمام باطل خداؤں کی غلامی سے آزاد ہونے کا دوسرا نام ہے۔

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

ان تمام اسلحہ جات کے ساتھ آراستہ ہو کر مومن اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ عرفان کے راستے میں ختم رسل حضرت محمدؐ عربی مومن کے سالارِ قافلہ ہیں۔ مومن کی کامل رہبری وہی فرماتے ہیں۔ اقبال چاہتے ہیں کہ سارے فلسفہ ہائے حیات کو چھوڑ کر حضور اکرم ﷺ کا دامنِ مبارک تھام لیا جائے

دل بر سخن محمدیؐ بند اے پورِ علیؓ! از بو علی چند؟

حضورِ اکرم ﷺ کی رضا کو اقبال رضائے الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پیر رومی کی طرح مریدِ ہندی بھی رضائے رسولؐ کو رضائے مولا کا ذریعہ مانتے ہیں۔ اقبال کی نگاہِ شوق و مستی میں پیغمبر آخر زماںؐ کی ذات گرامی ہی دین ہے۔ اول و آخر۔ روحِ قرآن اور سر کائنات ہے۔

یہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دین ہمہ اُست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال منزل ہائے تصوف سے مکمل طور واقف تھے۔ علم سے ایمان۔ ایمان سے عمل۔ ایمان و عمل سے عرفان و معرفت اور معرفت سے ایقان کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ ایقان وہ درجہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ بندے کو کلی طور اپنا لیتا ہے اور پھر بندے کے ہاتھوں سے اپنا کام کراتا ہے۔ بندے کی زبان سے اپنے مشن کی تبلیغ کا کام لیتا

ہے۔ بندے کے کانوں سے سنتا ہے اور بندے کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اقبال نے ایقان کے درجہ ایمان کا نہایت سنجیدگی سے نوٹس لیا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

ایقان کے درجہ پر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرد کو ملت کا نگہبان بنا کر مامور کرتا ہے۔ وہ فرد کے تکمیلِ کُل کو بھی خود اپنے اندر ایک منزل تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اس کا فقط ایک مقصد ہے افکار کی وحدت قایم کرنا۔ وحدت افکار قوت بازو سے دستیاب ہو سکتا ہے جو ایک فرد سے نہیں بلکہ پوری ملت کا خاصہ ہوتی ہے۔ اسی لئے فرد کا ملت میں ضم ہونا ضروری ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال کے ہاں تکمیل کردار سے حاصل کی ہوئی تمام ذاتی اور انفرادی صلاحیتوں کو تعمیر ملت کیلئے بروئے کار لانا تصوف کا فرضِ اولین ہے۔ اس تعمیر ملت کو انہوں نے کبھی "پاسبانی حرم" کا فریضہ اور کبھی "درمان درد حرم" کا نام دیا ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام دیں مقصد ایک اسلامی سٹیٹ ہے جو اس دور کا اعادہ کرے جس کا مشاہدہ تاریخ نے قرونِ اولیٰ میں کیا تھا۔

تصوف کے چند خدوخال کی نشاندہی کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی

ہے کہ اقبال تصوف کو وہ اکسیر سمجھتے تھے جس سے ملت کے امراض کا علاج ہو سکے۔ وہ تصوف کا آبِ حیات افراد ملت کو پلا کر ان سے ایک قوم بنانا چاہتے تھے۔ جو جاوداں اور لازوال ہو جائے۔ وہ تصوف نامہ کی اس سماجی حلقہ بندی کو جو مسلک زندگی سے فرار اور قنوطیت پیدا کرے، افیون اور گانجے سے کم مضر نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس قسم کے "تصوف" سے ملت کے نوجوانوں کے اعضاء شل ہو جاتے ہیں۔

قاضی صاحب چند معاصرین کی نظر میں

پروفیسر غلام محمد شاد

انسان کو گوناگون فضیلتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اچھے برے احساس کی قوت بھی فطری طور سے عطا کی ہے۔ جس کی بدولت اس کی پسند و ناپسند کا کچھ نہ کچھ معیار ضرور ہوتا ہے۔ جس کے مطابق وہ کائنات کی ہر چیز اور اپنے گرد و پیش میں رہنے والے لوگوں اور اپنے متعلقین کا جایزہ لیتا ہے اور ان سب چیزوں اور انسانوں کیلئے اپنا ایک احساس رکھتا ہے۔ اور کبھی کبھی اسے ظاہر بھی کرتا ہے۔ خصوصی طور پر ایک بیدار شعور، وسیع دماغ اور حساس ذہن رکھنے والا اور تحریری قوتوں کے سرچشموں سے فیض یاب شخص یعنی قلم کار تو یہ قوتِ فیصلہ اور ہی زیادہ گہری بصیرت اور مشاہدہ کے ساتھ رکھتا ہے۔ وہ اپنی رائے یا تبصرہ تنقید و تنقیص۔ ہجو، طنز، مزاح، مدح و تعریف، یعنی اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی اچھی بری حقیقت پر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اور اس طرح سے کسی مثبت یا منفی پہلو کی عکاسی یا وضاحت کرتا ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ ان دو پہلوؤں سے کسی بھی دور میں کوئی بھی شخص یا

چیز، خصوصاً حیاتِ انسانی کے مختلف میدانوں میں سر بر آوردہ لوگ خالی نہیں رہے ہیں۔ استثناء تو شاذ ہے ہی۔ عمومیت کے تناظر میں اتنا تو ہو سکتا ہے کہ کسی کی نظر دوسرے کی غلطیوں، برائیوں یا منفی پہلوؤں کی ٹوہ میں اتنی گم ہو جائے کہ اس کی ساری خوبیاں نیکیاں یعنی روشن اور مثبت پہلو دیکھنے والے کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔

کسی سماج، معاشرہ یا کسی فرد کے کمزور اور منفی پہلوؤں کو اچھالنا، ان کی تشہیر کرانا اور انہیں ظاہر کرنا بہت ہی آسان کام ہے۔ جسے ہو کوئی شخص جب بھی چاہے اپنی پوری استعداد کے ساتھ بروئے کار لا سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مثبت اور روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے کیلئے بڑے ہی پختہ شعور اور سنجیدہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام وسیع القلبی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ پر خلوص اور منصفانہ ہمدردی کے ساتھ کسی کی شخصیت یا اس کی تحریر و آثار کے روشن اور مثبت پہلو واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جو دوسرے انسانوں کیلئے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہ کام ذرا مشکل ہے۔ جس کو اجاگر کرنے کیلئے کوئی بھی لاپرواہی خود غرضی، رشک و حسد یا ظاہر میں محسوس نہ ہونے والی دل میں پلی ہوئی پوشیدہ معاصرانہ چشمک اور نفرت وغیرہ۔ نہ صرف زیر بحث شخصیت یا اس کے کارناموں کی خوبصورتی اور اس کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو مجروح کر سکتی ہے۔ ان کا حلیہ بگاڑ سکتی ہے یا بات کو کچھ سے کچھ اور کرا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور زمانے میں معاصر ادیبوں، اور شاعروں کے ایک دوسرے کے بارے میں ان کے لکھے ہوئے تبصروں اور تجزیوں (اگر وہ کبھی ایسی مہربانی کریں گے بھی) میں بے لوث قلم، مخلصانہ اور مثبت رویوں کی کمی اور فقدان نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس

کسی بھی سر بر آوردہ شخصیت یا کسی شاعر، ادیب، اور نقاد کے فن پاروں اور کارناموں کے روشن اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا وقت جب ہی سامنے آتا ہے۔ جب وہ اس رزم گاہ خیر و شر سے اپنا بوریا بستر ہ باندھ کر عافیت گاہِ آخرت میں آرام فرما ہو جاتا ہے۔ یا اس وقت جب کہ اپنے مقصد کو واضح شکل پیش نظر رکھنے والے اور ادب و فن پر مکمل دسترس رکھنے والے مخلص اور دیانتدار اور غیر جانبدار حضرات آگے آتے ہیں۔ جن کی فکر و نظر میں خلوص، ہم آہنگی اور خیالات میں بے لوث یکسوئی ہوتی ہے۔

میرے ان سب معروضات کا مطلب کسی بھی صورت میں یہ نہیں لیا جائے کہ شاعر و ادیب کے فن اور ادب یا مجموعی طور پر اس کی ادبی شخصیت کے منفی پہلوؤں کی پردہ پوشی کی جائے یا پاسِ دوستداری کا خیال رکھتے ہوئے ان کو یکسر نظر انداز کیا جائے۔ یا عمیق ابہام کے تحت ان کی گمراہ کن وکالت کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی بھی قدم اٹھانا کوئی صحت مند رجحان اور مناسب رویہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کیلئے ہمدرد، انصاف پسند اور مخلص دل چاہئے۔ کیوں کہ جب منفی پہلوؤں کا اظہار، یعنی کسی کی غلطیوں اور خامیوں کا تذکرہ ہمدردی، انصاف، اور خلوص کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ فائدہ مند اور کارگر ثابت ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ہم مکمل بے تعلق یا اجنبی بن کر جو دل میں آئے، برا بھلا لکھ ڈالیں جب کہ ہم بھی اسی سماج میں رہتے ہیں اور اس کی ہر برائی بھلائی میں ہم بھی طوعاً و کرہاً کسی نہ کسی طرح سے برابر کے شریک ہیں۔

ہمارے ہاں یعنی کشمیر میں حالات نہ صرف معکوس ہیں بلکہ بے انتہا

عجیب و غریب ہیں یہاں معاصر نقاد اور مبصر اپنے ہم عصروں اور ان کی تخلیقات کے بارے میں بالکل ہی سرد مہر واقع ہوئے ہیں۔ کسی کے فن پاروں کے روشن اور مثبت پہلوؤں پر توجہ تو کجا منفی پہلو بھی ہمدردی اور خلوص کے ساتھ درخور اعتنا نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ ہاں مفادِ خصوصی کی بات الگ ہے۔ اب اگر کسی کے فن اور ادب کے بارے میں کسی نے بادلِ ناخواستہ کبھی کچھ لکھنے کی زحمت گوارا کر بھی لی تو وہ تحریر اکثر مخلصانہ ہمدردی، تجزیہ اور عدل و انصاف سے معرّا ہوتی ہے۔ وہ رواروی اور سطحیت کی شکار ہوتی ہے۔ اس کی کچھ وجوہات ضرور ہو سکتی ہیں جن میں نہایت ہی قسم کی مصلحت پرستانہ بزدلی، یا حسد و رشک کہ کسی کی خوبیاں اجاگر ہونے سے وہ نمایاں منظر میں آ کے ' بڑا' بن جائے گا یا یہ خوف کہ دیانتداری اور خلوص کے ساتھ بھی اگر کسی کے منفی پہلوؤں کی نشاندہی ہو گی، تو خواہ مخواہ کی رقابت، اور دشمنی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس پسِ منظر میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ گذشتہ دو دہائیوں سے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں برابر چھپتی رہیں ان کیلئے لکھے گئے دیباچے، تمہید، اور پیش لفظ پاس دوستداری کرتے ہوئے پھسپھسی مدح سرائی سے لدی ہوئی عبارت آرائی کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہمارے ملک کے نامور ادیب، شاعر اور باوقار نقاد، میرے محترم بزرگ پروفیسر حامدی کشمیری صاحب نے اپنے وقیع تنقیدی مضامین کے مجموعہ "امکانات" میں "فانی بدایونی کا تخلیقی ذہن" کے عنوان کے تحت اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ " (اردو) (یہی حال کشمیری کا بھی ہے) تنقید کی کوتاہی یہ ہے کہ یہ بالعموم قدر شناسی

(یعنی in-assessment of values) کی شکار رہی ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نقادوں نے تنقید کو تحسینی اور صحافتی تبصرہ نگاری کے مترادف سمجھا ہے۔ یہی سطحی اور مدحیہ تنقید سکۂ رائج الوقت ہے" (صفحہ ۲۹) محترم حامدی صاحب خود اسی رویہ کے شکار ہوئے ہیں اور طرفہ یہ کہ خود انہوں نے بھی یہی رویہ اپنے کشمیری معاصرین کے ساتھ روا رکھا گویا کہ یہ ایک روایت ہی ہے۔ ایسے ماحول میں خود ادیب، شاعر یا فنکار پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خود اپنی من پسند یا مناسب شناخت (یا تعارف و تشہیر) کروانے کے لئے ایک ماحول تیار کرے جیسا کہ انگریزی کے مشہور شاعر ولیم بلیک (W. Blake) نے کہا تھا کہ " ہر بڑے اور خلاق شاعر اور ادیب کو اپنی عظمت اور خلاقی کے تناسب سے خود اس ذوقِ سلیم کیلئے فضا تیار کرنی پڑتی ہے جس سے ان کے فن کی پرکھ کی جائیگی" مطلب یہ ہے کہ ہر بڑا فنکار اپنی تخلیقات میں ایسی فنی یا فکری قدروں کا اضافہ کرتا ہے جس کو پوری طرح سے پرکھنے کیلئے نئے ذہنی رویہ اور نئے فنی سانچوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کے فراہم کرنے میں فن کار خود مدد کرتا ہے" لیکن بلیک کے مشورے پر کتنے لوگ عمل کر سکتے ہیں۔؟ اکثر تو طبیعتاً ایسے طریق کار سے گریز کرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ جیسا کہ مرحوم قاضی غلام محمد صاحب کا حال تھا۔ رہی قدر شناسی کی بات، معاصرین میں ایسی بات بالِ عنقا کی زیارت کے مترادف ہے۔ اس لئے ان معروضات کے پسِ منظر میں یہ کہتے ہوئے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتا ہوں کہ مرحوم قاضی صاحب کو ان کے معاصر ادیبوں اور نقادوں نے ان کے جیتے جی کسی نہ کسی طرح گوارا تو کر لیا۔ لیکن شعر و ادب کی بات کرتے وقت انہیں

در خود اعتنا نہیں سمجھا۔ اس صورت حال کے لئے جیسا کہ اشارتاً کہا گیا ہے، مرحوم کی مستغنی عن التشہیر قلندرانہ طبیعت بھی بہت حد تک ذمہ دار ہے۔ انہوں نے علم وادب کا جو زاویہ اپنے لئے مختص کیا تھا وہ اس میں ذاتِ واحد اور لاشریک ولا سہیم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو حیران کن ذہنِ رسا اور پیچیدہ معانی کیلئے قوت فہم عطا فرمائی تھی۔ وہ بھی ان کی ریکا گنشن کیلئے رکاوٹ بن گئی۔ ان کی انہی خصوصیات نے ان کے منفی احباب میں بھی غیر محسوس طور پر اضافہ کیا تھا۔ ایک لحاظ سے وہ "ائے روشنی طبع تو بر من بلا شدی" کے شکار ہوگئے۔ ان کے قریبی معاصرین ان کے تعمیری اور نکتہ آفرین مشوروں اور حوصلہ افزائیوں سے مستفید تو ہوتے رہے لیکن جب بھی ان کی باری کا موقعہ آتا تھا تو وہی لوگ شاطرانہ دلبری سے انہیں نظر انداز کرتے تھے۔ اہلِ دنیا کے اس طرز تپاک کا کوئی علاج نہیں ہے۔ غنی کشمیری اور مرزا غالب جیسے نوابغ روزگار اور عبقری بھی اپنے اپنے زمانے میں ایسے ہی سلوک کے شکوہ سنج رہے ہیں۔

میری اس تحریر کو محض شکوہ شکایات پہ محمول نہیں کیا جانا چاہیے۔ بلکہ یہ امر واقع کی وضاحت ہے۔ میرا یہ ارادہ مایوسی کا شکار ہوا کہ میں قاضی صاحب مرحوم کے فن اور شاعرانہ حیثیت کے بارے میں ان کے معاصر کشمیری نقادوں اور ادیبوں کے وقتاً فوقتاً بیان کردہ تاثرات کے تناظر میں، ان کا ایک جامع تذکرہ اور ان کی شعر و شاعری کے بارے میں کئے گئے تجزئے اور تبصرے ایک ہی مضمون میں جمع کر کے احبابِ قاضی صاحب کیلئے ضیافت طبع کا سامان کردوں۔ کیونکہ بسیار جستجو اور تلاش کے بعد صرف چار حضرات کی تحریریں دستیاب ہو سکیں، جو قاضی صاحب

کے معاصر تھے۔ اور اب مرحوم ہیں۔ ان میں سے تین غیر ریاستی اور ایک ہی صاحب ریاستی ادیب تھے اور وہ بھی وادی کے نہیں بلکہ جموں کے تھے۔ یعنی ہماری وادی کے کسی نقاد اور ادیب کی ایسی کوئی تحریر نہیں مل سکی جو قاضی صاحب کی زندگی میں ہی شایع ہوئی ہو۔

۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت صدر کے تشریف لائے۔ مرحوم زور صاحب جب قاضی صاحب سے اچھی طرح سے متعارف ہوئے تو وہ نہ صرف ان کی ادیبانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں سے واقف ہوئے بلکہ ان کے وسعت مطالعہ، نکتہ رسی، قوت حافظہ، فارسی اور اردو ادب پر ان کی گہری اور وسیع نظر اور ان کی علم اور علماء دوستی سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ کچھ وقت کے بعد وہ قاضی صاحب ہی کے توسط سے پروفیسر اپورب سومناتھ صاحب سے بھی متعارف ہوئے جو قاضی صاحب کے قریبی دوست تھے۔ قاضی صاحب رند بے نیاز کی طرح اپنی متاع گراں بہا کی حفاظت کرنے کی طرف سے بالکل لاپرواہ تھے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کو صفحۂ قرطاس کے حوالے تو کیا تھا۔ لیکن ان کی جمع آوری کو مشکل سمجھ کر اس سے کتراتے رہے۔ اس کیلئے وہ فکر مند بھی نہیں تھے۔ لیکن زور صاحب اور اپورب جی قاضی صاحب کے پیچھے پڑ گئے اور ان سے اپنے سنجیدہ و مزاحیہ کلام کا مجموعہ مرتب کرا کے ہی انہیں دم لینے دیا۔ اس طرح بہت کدو کاوش کے بعد زور صاحب نے قاضی صاحب کے اس مجموعہ کلام "حرفِ شیرین" کو ۱۹۶۲ء میں ادارہ ادبیات حیدر آباد کے ذریعہ زیور طباعت سے آراستہ کروایا۔ مجموعہ اتنا مقبول عام ہوا کہ طباعت کے سال ہی میں اس

کی ساری کاپیاں ادارہ ادبیات نے فروخت کیں۔ڈاکٹراپورب جی اور ڈاکٹر زور صاحب، دونوں نے "حرفِ شیریں" کیلئے اپنا الگ الگ پیش لفظ تحریر کیا۔زور صاحب مرحوم نے جب قاضی صاحب کو "دریافت" کیا تھا تو پیکر حیرت واستعجاب بن گئے تھے۔ 'حرف شیرین' کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"جب سے میں کشمیر میں قیام پذیر ہوں، برابر محسوس ہوتا رہا ہے کہ اس سرزمیں کے رہنے بسنے والوں کو علم و فضل، شعر و سخن اور فنونِ لطیفہ سے ایک طرح کا فطری لگاو ہے۔ چوں کہ یہ خطہ جنت نظیر بڑے بڑے پہاڑوں اور دشوار گذار راستوں سے محصور رہا ہے اس لئے یہاں کے شاعر وادیب اور فنکار بیرونی دنیا سے بالکل علیحدہ رہے ہیں۔ ان کے فطری جوہر یہاں کے لاتعداد پھولوں اور رنگ و نکہت کی بہاروں کی طرح یہیں اپنی چمک دمک دکھا کر رہ جاتے ہیں۔اور باہر کی دنیاان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتی، اہلِ کشمیر قدرت کی تمام نعمتوں سے دل کھول کر استفادہ کرتے ہیں اور بہارو خزاں کی رنگا رنگی میں یکساں لطف لیتے ہیں۔ ان کو اس کی پرواہ نہیں کہ دوسرے ان کی قدر کریں یا وہ ان کی خوبیوں سے لطف اندوز ہوں۔ وہ خود لطف حاصل کرنا جانتے ہیں اور اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔"

میرا پورا یقین ہے کہ زور صاحب نے اپنا یہ مشاہدہ قاضی صاحب کی شخصیت کے رنگارنگ پہلوؤں کے مطالعہ کے بعد ہی تحریر فرمایا ہوگا کیوں کہ اس کے بعد زور صاحب لکھتے ہیں کہ "ایسے ہی مست الست لوگوں میں جلمعۂ کشمیر کے

شعبۂ ریاضیات کے پروفیسر قاضی غلام محمد بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جب میں نے ان کا کلام سنا اور پڑھا تو محسوس ہوا کہ ایک خشک مضموں کے استاد میں یہ اعلیٰ پایہ کا باشعور اور دیدہ ور شاعر چھپا ہوا ہے۔ ایک ایسا شاعر جس کو نہ اپنے کلام کی خوبیوں پر ناز و افتخار ہے اور جو نہ اپنے ہم چشموں کی تحسین و آفریں کا محتاج و منتظر ہے"۔ حیرت و استعجاب کے اس اظہار کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر زور صاحب پروفیسر قاضی صاحب کے بارے میں پتے کی بات کہہ گئے ہیں جس سے قاضی صاحب کے مزاج کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ زور صاحب لکھتے ہیں "وہ (قاضی صاحب) شعر لکھتے ہیں اور خود ہی اس سے محظوظ ہو کر مگن رہتا ہے۔ نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔"

ڈاکٹر زور صاحب نے قاضی صاحب کے کلام کو تنقیدی نظر سے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "قاضی صاحب کے کلام میں زندگی اور زندہ دلی کے جن عناصر کی فراوانی ہے ان سے کسی قوم کے مزاج اور ماحول کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ نیا کشمیر جن ولولوں اور امنگوں کی آماجگاہ ہے ان سے اس کلام کے بعد نہ صرف آگاہی ہوتی ہے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی جاندار اور پر تکلف شاعری کس قسم کے ماحول میں نمودار ہوتی ہے"۔۔۔۔ "ان کا سنجیدہ کلام قدیم اور جدید اسالیب سخن کے ایک ایسے امتزاج سے معمور ہے جو ایک فطری اور بے لوث شاعر کے موئے قلم کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ نقاشی بھی کرتے ہیں اور اپنے تصور سے اپنے ماحول کے ایسے رنگارنگ نقشے صفحۂ کاغذ پر بکھیر دیتے ہیں جو کشمیر کے دوسرے فنکاروں کی صنعت گری اور نقش و نگار سے زیادہ دیرپا اور دوررس اثرات کے حامل ہیں۔"

ڈاکٹر اپورب سومناتھ صاحب قاضی صاحب کے قریبی دوست تھے۔ دونوں حافظ شیرازیؔ اور مرزا غالبؔ کے عاشق تھے۔ یہی بات ان کی دوستی اور قربت کی خاص وجہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف تھے۔ قاضی صاحب پینے پلوانے کے معاملات میں زاہد خشک تھے۔ جبکہ پروفیسر اپورب سومناتھ جی رند بلانوش تھے۔ "انہوں نے "حرفِ شیریں" کا پیش لفظ انگریزی میں لکھا ہے۔ وہ قاضی صاحب کی شاعری کو سراہتے ہیں اور ان کی پیروڑی نگاری کی تکنیک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ (قاضی صاحب) قدیم شعراء کے رومانی تصورات اور موجودہ حقایق کے درمیاں تضاد کو واضح کر کے استہزا پیدا کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کا ایک اور طریقہ غلو کا ہے۔ جسے وہ طنز کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔"

"حرفِ شیریں" کی طباعت (۱۹۶۲ء) کے سترہ سال بعد پاکستان میں رہ رہے ریاست جموں و کشمیر سے ہجرت کئے ہوئے ایک شاعر و ادیب جناب حبیب کیفوی صاحب نے "کشمیر میں اردو" کے نام سے ایک ضخیم تذکرہ یا ادبی تاریخ تصنیف کی، جسے ۱۹۷۹ء میں مرکزی اردو بورڈ گلبرگہ لاہور نے اپنے سلسلۂ مطبوعات کے منصوبے کے تحت طبع کرا کے شایع کیا۔ محترم حبیب کیفوی صاحب نے قاضی صاحب کا بھرپور تذکرہ لکھا ہے اور ان کو نہایت ہی شاندار طریقہ پر خراج عقیدت و ستایش ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قاضی صاحب کے مزاحیہ اور طنزیہ کلام اور سنجیدہ شاعری کے بھی بہت سے اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حرفِ شیریں" قاضی صاحب کے سنجیدہ اور مزاحیہ کلام کا مختصر سا مجموعہ

ہے جس کے توسط سے ان کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ حرفِ شیریں بلاشبہ صنف طنز نگاری میں قابل قدر اضافہ ہے اور یقیناً اس کے مطالعہ سے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے (صفحہ ۴۵۶) آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں کہ

"قاضی صاحب اگرچہ ریاضی کے استاد ہیں لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو فارسی ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ نہ صرف طربیہ اور طنزیہ صنف سخن پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ ان کا سنجیدہ کلام بھی قابل تعریف ہے۔
(صفحہ ۴۵۹)

مرزا غالبؔ کی ایک غزل پر قاضی صاحب کی پیروڑی یعنی "ڈر نہیں کہ ہجر میں جینا محال ہے ڈر ہے کہ خاکسار کثیر العیال ہے" ذکر کرتے ہوئے جناب کیفوی صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ رنگ سخن قطعاً اختیاری نہیں ہوتا ہے۔ قدرت سے اس کیلئے ذہن رسا عطا ہوتا ہے اور شاعر اس صلاحیت کو بروئے کار لا کر افسردہ لبوں کو تبسم عطا کرتا ہے۔ قاضی غلام محمد کو قدرت نے یہ وصف بخشا ہے کہ وہ دوسروں کو مسرور کریں۔ خواہ خود وہ کتنے ہی دل گرفتہ کیوں نہ ہوں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

قابلِ داد ہے اس شخص کی رنگینی فکر
دلِ خوں گشتہ کو جو زیست کا عنواں سمجھا

"قاضی صاحب کی سنجیدہ شاعر بھی داد کے قابل ہے۔ نئی علامتوں اور نئی ترکیبوں سے وہ اپنے تاثرات کو شعری جامہ پہنانے میں بڑے کامیاب نظر آتے ہیں ان کی غزلوں میں غم زمانہ بھی ہے اور غم جاناں بھی۔ گہرائی بھی ہے اور نغمگی بھی۔ (صفحہ ۴۶۵)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی وفات کے بعد پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی کے صدر مقرر ہوئے۔ وہ سرعت کے ساتھ کام کرنے والے محقق تھے۔ نہ صرف کام کرتے تھے۔ بلکہ ان کو انجام تک پہنچاتے بھی تھے۔ کشمیر میں رہ کر انہوں نے بہت سی ادبی خدمات انجام دیں۔ جن میں کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ اور دیگر کتابوں کے علاوہ تین ضخیم جلدوں میں "کشمیر میں اردو" کے نام سے ضخیم تاریخ اردو ادب کشمیر بھی شامل ہے۔ جسے ان کی وفات کے بعد جناب محمد یوسف ٹینگ نے ایڈٹ کر کے کلچرل اکادمی کے ذریعہ شایع کروایا۔ مرحوم عبدالقادر سروری صاحب کو بھی پروفیسر قاضی غلام محمد کو نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ لیکن انہوں نے کشمیر کے کئی سربرآوردہ ادیبوں اور شعراء کا تذکرہ سطحی طور پر اختصار کے ساتھ کیا ہے جو کسی بھی صورت میں ان کے شایان شان نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر سروری صاحب کا یہ کارنامہ (کشمیر میں اردو) رواروی، اور سہل انگاری یا بڑھاپے کے ضعف و نقاہت کا شکار ہوا ہے۔ یا کسی اور پراسرار حادثے کا، اس میں ایک رننگ کومنٹری کا رنگ غالب طور پر جھلکتا ہے۔ سروری صاحب تو قاضی صاحب کے بزرگ ہم عصر تھے اگر وہ چاہتے تو وہ قاضی صاحب کی شعر و شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کر سکتے تھے۔ اور اس کا تنقیدی نکتہ نگاہ سے بھی جائزہ لے سکتے تھے۔ بہر حال جو کچھ بھی ان کے قلم سے تحریر ہوا ہے بسا غنیمت ہے اور ہم اسے مقدس تبرک جانتے ہیں۔ قاضی صاحب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

(قاضی صاحب) "علمی ذہانت اور ستھرا ادبی مذاق بھی رکھتے ہیں۔ قاضی

غلام محمد کا اردو اور فارسی کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور خاص طور پر غالبؔ کی شاعری میں نئی معنویت کی تلاش ان کی ذہانت کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ شعر و سخن کا ان میں بہت ستھرا ذوق نصیب ہے۔ لیکن ان کا رجحان، مزاح اور طنز کی طرف زیادہ ہے۔ پیروڈی جو ایک مشکل فن ہے۔ اس میں قاضی کو ایک خصوصیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے ہندو پاک کے شعراء میں انہوں نے ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ قاضی کے یہاں آمد ہوتی ہے۔ سنجیدہ شعرا کے سنجیدہ تصورات کو مضحک مرتبے پر لانے کا قاضی کا اپنا اسلوب ہے۔ قاضی کی ذکاوت مضحک موقف پیدا کرنے کے گروں کو بخوبی جانتی ہے۔ کبھی وہ سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو سنجیدگی کو بے جوڑ اور بے محل انداز میں رکھ کر، کبھی سنجیدگی سے مضحکہ خیز موضوع پیدا کر کے اور کبھی سنجیدہ موضوعات کے چہرے سے بہ ظاہر سنجیدگی کا نقاب ہٹا کر خندہ ریزی کے مواقع پیدا کر دیتے ہیں ان کا مقصد اپنے اطراف کے سماجی مسائل کو ابھارنا ہوتا ہے۔"

(صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱)

"قاضی کی فکر کا سارا سرمایہ پیروڈی ہی نہیں بلکہ وہ حقیقی شعری قدروں کے حامل طبع زاد مزاحیہ شعر کہنے پر بھی یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے عہد کے شاعر ہیں اور اس عہد کے مسائل کو انہوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔"

(صفحہ ۱۳۱۔ کشمیر میں اردو، سروری جلد ۳)

"حرف شیریں" کے کچھ فن پاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے سروری صاحب فرماتے ہیں کہ "اس مجموعے میں 'مفلسی کا قومی ترانہ' 'انٹرویو بورڈ کے سوالات' اور "پیرو

مرید "عمدہ فن پارے ہیں۔ انٹرویو بورڈ کے سوالات، بلند و پست اور پست اور بلند کو جوڑ کر ان کی بے معنگی کے ابھارنے کی اچھی مثال ہے۔" (صفحہ ۱۳۲۔ ۱۱۳)

اس کے بعد سروری صاحب قاضی ساحب کی سنجیدہ شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ایک سنجیدہ غزل چند شعروں کا اقتباس پیش کر کے لکھتے ہیں کہ "ان سے غزل کی روایت پر ان کے قابو کا اندازہ ہوتا ہے" (صفحہ ۱۳۳)

آگے چل کر سروری صاحب لکھتے ہیں "قاضی کو زبان اور اظہار پر بھی بڑی اچھی قدرت ہے اور ان کے بعض تجاوزات جن میں سے کچھ بلا قصد ہیں اور کچھ قصداً یا ضرورتاً کئے گئے ہیں۔ ان سے کہیں کہیں زبان میں مقامیت کا رنگ ابھرتا ہے۔ جسے ایک حقیقت پسند نقاد، شاعر کی فطرت سے تعبیر کرتا ہے۔ (صفحہ ۱۳۴)

پروفیسر حامدی کشمیری نے جن کا ذکر قبلاً ہو چکا ہے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعہ "امکانات" میں حسرت موہانی وغیرہ کیلئے دو دو مضامین، کا اصراف کیا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے استاد شہ زور کشمیری یا شوریدہ کشمیری یا پھر قاضی غلام محمد کی شاعری کا تنقیدی نکتہ نگاہ سے سیر حاصل تجزیہ بھی اس میں درج کرتے تو کشمیر سے باہر کے وہ ہندوستانی اردو والے ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ جن سے وہ اپنے نظر انداز کئے جانے پر زیرِ لب شکایت کرتے ہیں۔ "جدید اردو شاعری میں طنز و مزاح" کی بات کرتے ہوئے پھر بھی انہوں نے کشمیر پر احسان فرمایا ہے کہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعروں کی گنتی کرنے کے بعد انہوں نے قاضی غلام محمد کی حاضری بھی لگادی ہے۔

من از بیگا نگاں ہر گز نتالم
کہ بامن ہر چہ کرد آں آشنا کرد

اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت

غلام رسول آزاد

اقبال کا زمانہ، ہندوستان میں انتہائی بے چینی کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان مکمل طور تاج برطانیہ کے تسلط میں چلا گیا تھا۔ ہندوستانی سماج ذلت آمیز غلامی سے پامال ہو رہا تھا۔ مغربی کلچر کی یلغار سیاسی بالادستی سے کہیں زیادہ صبر آزما تھی، جس نے ہندوستانی فہم و فراست اور اندرونی صداقت سے اپنا رشتہ کھو دیا تھا۔ اگرچہ یہاں کے تمام طبقے اور مذہبی گروہ فرنگی اثر و نفوذ اور کلچر کو مشتبہ سمجھتے تھے اور اس کی پیش قدمی روکنا چاہتے تھے لیکن ایک عیار و مکار اور غالب قوم کے سامنے عاجز ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ ہندوستان جیسے اشوک (۳۰۰ ق م) کے بعد اکبر اعظم، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب نے متحد کیا تھا آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ تک آتے آتے سینکڑوں ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ

ظفر کی گرفتاری اور جلاوطنی کے وقت مغلیہ حکومت صرف لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پورے ہندوستان کو جاگیر دارانہ اور نوابی کلچر نے زوال کے آخری نقطے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس دور کے ادب سے اس ماحول کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ نہایت پر تصنع ، پر تکلف اور خوشامد سے عبارت ہے۔ نوابی زندگی کی طرح عیش و عشرت اور پر تکلف منافقت اس دور کے ادب کا غالب رنگ ہے۔ جہاں کہیں اس مخصوص کیفیت سے باہر نکلنے کی کوشش ہے وہاں شدید درجے کا اضطراب، منتشر خیالی، تلخ نوائی، تیکھا طنز، کہیں پہ پاتال تک بے ہنگم غواصی اور کہیں پر عرش تک ہیبت ناک اچھال زمان و مکان کی بسیط فضاؤں میں تخیل کی بے مہار اڑان، غالب کی شاعری اس کی عمدہ مثال ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

یا پھر

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

یا

مجموعی طور ہندوستانی سماج کے ضعف و زوال کا یہ حال تھا کہ اگر ۱۸۵۷ء کے غدر کا سانحہ نہ بھی ہوتا۔ انہدام اس کا مقدر بن چکا تھا۔ سازشوں کے جال میں پھنسے ہوئے بہادر شاہ ظفر کی تاج برطانیہ کے خلاف بے سر و سامان جدوجہد تاریخ کی ایک انوکھی مثال ہے۔ ہندوستان کا مسلمان معاشرہ جو اپنی عظیم روایات سے

کٹ چکا تھا بہادر شاہ ظفر جس کا علامتی کردار تھا۔ اسلاف کے کارناموں کا قصیدہ خواں تھا یا پھر لٹی ہوئی بہاروں کا نوحہ خوان تھا۔ دوسری طرف ہندو سماج کی حالت بھی کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ ہندو مذہب ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے عقیدوں میں منقسم تھا۔ رسوم ورواج اور ذات پات کی تقسیم نے پورے ہندو معاشرہ کو لخت لخت کیا ہوا تھا اور سیاسی محرومیوں کا کرب ہندو نفسیات کا حصہ بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں غاصب قوم کو ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھنے میں کافی آسانی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی جغرافیائی، نسلی، لسانی اور مذہبی تقسیم بھی اس کے اتحاد میں مانع ثابت ہوئی تھی اور ادھر غاصب قوم ان تمام کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا جانتی تھی۔

اس صورت حال سے ہندوستان کے دانشور طبقے میں خاصی بے چینی تھی۔ لیکن کسی تبدیلی کے دور دور تک آثار نظر نہ آتے تھے۔ تاہم اس دور میں سیاسی بیداری کے ساتھ اصلاحی تحریکوں کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک تاریخی اعتبار سے خاصی اہم ہے۔ راجہ رام موہن رائے پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے قومی اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا اور آواز بلند کی کہ ایک قوم بننے کیلئے کسی ایک مذہب کا ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک سماجی نظام، اقتصادی نظام اور ایک جغرافیائی ریاست کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ہندو سماج کے اندر مختلف دیوی دیوتاؤں کی پرستش، رسوم ورواج اور ذات پات کی تقسیم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے توحید کے فلسفے پر زور دیا۔ جو نہ صرف قومی اتحاد کیلئے ضروری تھا بلکہ اپنشدوں اور گیتا کی تعلیم کی روح تھا۔ جس سے ہندو قوم دور جا پڑی تھی۔ اسی طرح ان کے بعد سماجی اصلاح اور قومی اتحاد کیلئے مشہور مصلح سوامی دیانند سرسوتی نے اسی پروگرام کو

زیادہ شدت اور جارحانہ انداز میں جاری رکھا۔ آریہ سماج کی بنیاد ڈالی اور ویدوں کی تعلیم کی طرف واپسی کا نعرہ بلند کیا۔ ان تحریکوں سے آگے چل کر ہندوستانی سماج پر نہایت مثبت اثرات پڑے۔ ان تحریکوں اور سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر ہندوستان میں ایک انگریزی پڑھا لکھا طبقہ، قومی شعور سے سرشار ابھر کر سامنے آیا۔ انگریز ہندوستانیوں کو مساوی حقوق دینے کیلئے تیار نہ تھے۔ ان کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کا دوستانہ رویہ ۱۸۵۷ء کے بعد بدل چکا تھا۔ سیاسی اقتدار پر مکمل قبضے کے بعد انگریز ہندوستانیوں کی توہین اور تذلیل پر اتر آئے تھے۔ اس سے ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ شدید تلخی اور بیزاری محسوس کرنے لگا۔ حکمران طبقہ کلیدی عہدوں پر ہندوستانیوں کی تقرریوں کے بھی سخت خلاف تھا۔ بلکہ وائسرائے ہند لارڈ کارنوالس نے انتظامی عہدوں کو انگریزوں کیلئے مخصوص کر دینے کی پالیسی اپنائی۔ وہ تمام مقامی لوگوں کو نااہل اور بددیانت سمجھتا تھا۔ اور اکثر کہا کرتا تھا کہ "میں بجا طور پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر ہندوستانی بددیانت ہے" حکمرانوں کے اس رویّے سے یہاں بے چینی بڑھتی گئی۔ اب سوال صرف سول سروسز میں تقرریوں کا ہی نہیں تھا۔ بلکہ تجارت پر برطانوی قبضے اور انگریز کے اجتماعی اخلاق کا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی اس کا غالب رنگ گاندھیائی تھا۔ یہاں انسانی زندگی کی حرمت اور زندگی کے اعلیٰ اصولوں سے عبارت تحریک آزادی عدم تشدد کے اصولوں پر چل رہی تھی۔ اوچھے حربوں اور مقصد کے حصول کے ہر حربہ کو جائز سمجھنے والی حکمران قوم گاندھیائی اندازِ فکر کی اخلاقی برتری سے تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ تحریک کو دبانے کیلئے کوئی ہتھکنڈہ اپنانے کے بعد خود کو پہلے سے زیادہ کمزور محسوس کرتی تھی۔ اسی طرح

مسلم معاشرہ میں بھی سر سید احمد خان نے علی گڑھ تحریک شروع کی۔ علامہ شبلی ،الطاف حسین حالی اور دوسرے اکابرین نے اسلامی معاشرے کو مایوسی اور مزاج خانقاہی سے باہر آنے کی ترغیب دی۔ آگے چل کو ان کوششوں سے بہتر نتائج بر آمد ہوئے۔

ہندوستان کے اس مخصوص سیاسی اور سماجی پسِ منظر میں اقبال کا جنم ہوا ان کی ابتدائی تعلیم اسی ماحول میں ہوئی۔ اس کے بعد کیمرج اور جرمنی گئے۔ جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی فلسفہ، تاریخ ادب اور دینیات ان کی دلچسپی کے موضوعات رہے۔ اس پس منظر اور تعلیم و تربیت میں اقبال کا مزاج اور افکار پروان چڑھے۔ جہاں فلسفے سے انہوں نے حقایق کو سمجھنے کیلئے باریک بینی کا درس لیا۔ وہاں تاریخ سے سماجی تبدیلیوں کے محرکات، سماجی حقایق کی پیچیدگیوں اور مضمرات کو سمجھنے اور مختلف نقاط نظر سے دیکھنے کی ترغیب حاصل کی۔ مذہب سے سماجی تعاون، تصادم اور کشیدگیوں کو دور کرنے کا درس دیا۔ مشرق کے غریب مایوس اور پریشان حال انسان اور مغرب کے امیر مضطرب اور ابلیسی اندازِ فکر رکھنے والے انسان کو اعلیٰ اخلاقی قدروں اور انسانیت کی معراج کا سبق یاد دلایا۔ شاعری سے اپنے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا کام لیا۔ اور مشرق کے واسیوں کو غور و فکر کی ترغیب دی۔ اقبال کے افکار کی ترتیب و تہذیب، سماجی تبدیلیوں کے عمل، رد عمل اور بصیرت افروز مطالعے سے ہوئی۔ اقبال کی فکر کو مشرق و مغرب کی اجتماعی کشمکش حیات نے کندن بنادیا۔ تاریخی، سماجی اور مذہبی شعور نے اپنے مخصوص دور سے اوپر اٹھنے کے امکانات پیدا کر دیئے۔ جس کا نتیجہ آج ہم بیسویں صدی کے اختتام پر دیکھ رہے ہیں اور فکر اقبال کی

اکیسویں صدی کے سماجی حالات میں معنویت تلاش کر رہے ہیں۔

اقبال کے دور میں تاریخ عالم کے دو بڑے واقعے سرزد ہوئے۔ ۱۹۱۴ء سے پہلی عالمی جنگ ہوئی۔ اور ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب برپا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی عالمی سطح پر دوررس تبدیلیوں کا دور شروع ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں دوسری جنگ عظیم ہوئی جس کا عبرت ناک انجام ۱۹۴۵ء میں جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے اور لاکھوں انسانوں کی زندگی تلف کرنے کے ساتھ ہوا۔ روسی انقلاب سے جس سرد جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ وہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سوویت یونین کے منہدم ہونے سے ختم ہوئی۔ پہلے دو حادثات اقبال نے عین شباب میں اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے۔ لیکن دوسرے دو حادثات چشم باطن سے دیکھے تھے۔ دوسری جنگ عظیم جو ۱۹۳۸ء سے شروع ہونے کو تھی اقبال نے آنکھیں موندلیں۔

یورپ کے صنعتی انقلاب۔ جمہوری انقلاب، علمی اور سائنسی انقلاب سے عالمی سطح پر ڈرامائی انداز میں تبدیلیاں آرہی تھیں۔ مجموعی طور علم وادراک کا سرمایہ بڑھنے سے سماجی و معاشی تبدیلیوں کی رفتار میں شدید حرکت اور تہلکہ انگیز انداز تھا۔ جہاں ایک طرف تاج برطانیہ کا سورج ڈوب رہا تھا وہاں ایک سپر طاقت امریکہ کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ یورپی قومیں سماجی تبدیلیوں کا جواز معاشی اور سیاسی اصطلاحوں میں ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب کہ یہاں مشرق میں بالخصوص اقبال کے انداز فکر میں سماجی اقدار کی شکست وریخت اور سماجی تبدیلیوں کا حل مذہب اور فلسفے کے تصورات میں ڈھونڈا جارہا تھا۔ لہذا طاقت کے عدم توازن، معاشی اور سیاسی انداز فکر کا زمینی

حقایق کے زیادہ قریب ہونے سے یورپ کا اندازِ فکر غالب رہا۔ اقبال کی فکر کو غالب آنے کیلئے جس طاقت اور سیاسی اثر ورسوخ کی ضرورت تھی وہ نہ اقبال کے وطن کے پاس تھا اور نہ اس کی اسلامی دنیا کے پاس تھا۔ لہذا اقبال کی فکر کا جمالیاتی، اظہار بیان اور بلند آہنگ مطلوبہ اثرات مرتب نہ کر سکے۔ اسی طرح ان کے فلسفیانہ انداز فکر کے مقابلے میں سائینسی ایجادات کی تخریب کاری، اور زندگی کے مختلف علوم میں تحقیق و تنقید کے عمل فلسفے اور مذہب کے بنیادی تصورات کو متزلزل کر دیا تھا اور اقبال کسی نئے زمانے کے خواب دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔

اقبال کے قومی اور بین الاقوامی پس منظر کے بعد ہم عالم اسلام کی طرف دیکھتے ہیں۔ مغربی دنیا کے شور وشر کے مقابلے میں عالم اسلام گراں خوابی میں تھا۔ اسلامی دنیا کے وہ علمی ومذہبی اجتہادات، اور جوش وجذبہ جو اسلام کے ظہور کے بعد ابتدائی چند صدیوں میں تھا ناپید ہو چکا تھا۔ وہ "زمانہ" جس کیلئے اقبال گردش لیام کا رخ پیچھے کی طرف موڑنا چاہتے ہیں قصہء پارینہ بن کر رہ گیا تھا۔ وہ "زمانہ" جب عرب قوموں نے علم، فلسفے ادب اور فن کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ ہند۔ چین اور یونان کے فلسفے کو کھنگال کر عربی ترجمے کر کے آنے والی نسلوں کیلئے محفوظ کر لیا تھا۔ جدید سائینسی علوم، سیاسی اور معاشی علوم میں یورپ دنیا سے صدیوں پیچھے رہ گیا تھا۔ خلافت عباسیہ کے بعد اسلامی مرکزیت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ اس دوران اسلام اگرچہ دنیا کے ایک قابل لحاظ حصے پر پھیل چکا تھا۔ لیکن اس کی روح اور صداقت، اقتدار اور سمجھوتوں کے دبیز غلافوں میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ عربوں کی دیگر اقوام عالم پر علمی برتری ختم ہو چکی تھی۔ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، قاہر دمشق،

کوفہ و بغداد جو کبھی دینی، علمی اور ذہنی جدوجہد کے مراکز تھے۔ اپنی روائتی آن بان اور شان کی آخری ہچکی لے چکے تھے۔ یہ مراکز صحرائے عالم اسلام میں عارضی راحت کے نخلستان تو ہو سکتے تھے۔ لیکن باب علم و فضل نہ رہے تھے۔

اقبال کے زمانہ تک آتے آتے صورت حال نہایت مایوس کن اور ابتر ہو چکی تھی۔ اگرچہ عالم اسلام میں اکا دکا اصلاحی تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔ کئی ممالک میں مسلمان حکمران بھی تھے۔ لیکن اسلامی شان اور دبدبے سے محروم تھے۔ اسلام کے اندر عقائد، مسلکی اور دینی امور میں اختلافات ابھر آئے تھے۔ اس دوران اگرچہ اسلامی دنیا میں دینی عالم اور مفکرین پیدا ہوتے رہے لیکن عظمت رفتہ کی بازیابی کیلئے ان کی کوششیں ناکافی ثابت ہوئیں۔ بیشتر حالات میں تو ایسا ہوا کہ یہ مفکرین کسی نئے مسلک یا عقیدے کے رواج کا باعث بنے۔ اقبال کے قریب کے زمانے میں سید جمال الدین افغانی نے عالم اسلام کو مغرب کے سیاسی اثرات سے بچانے کی کوشش کی۔ شیخ محمد عبدہ اور سر سید احمد خان اور علامہ شبلی نے بھی تحریکیں چلائیں۔ لیکن یہ تحریکیں اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ بہت محدود تھیں اور بڑی تبدیلیوں کا متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ پوری اسلامی تہذیب، اسلامی جوہر سے خالی تھی۔ عالم اسلام نئے علوم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے سے عاری تھا۔ اور زندگی کے جدید بحران اور مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی سکت نہ تھی۔ لہذا جہاں اقبال کی فکر اپنے ہم وطنوں کے ضعف سے عاجز تھی وہاں اس کیلئے اسلامی دنیا کی صورتحال بھی حوصلہ افزانہ تھی۔ اور دوسری طرف مغربی سوچ اور سیاسی اثر و رسوخ اور تسلط کی سردرات میں اس کی فکر کا پارہ غلطاں و پیچاں و لرزاں تھا۔ عالم اسلام میں اقبال شاید بیسویں

صدی کے تنہا شخص تھے جنہوں نے اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کو سمجھا۔ مغرب کے تجارتی، علمی اور سیاسی غلبے کے درد و کرب کو اپنے وجود کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ وہ زندگی بھر اپنے وطن مالوف اور عالم اسلام کی زبوں حالی کے شاکی رہے اور ایک بڑی صحت مند تبدیلی کے آرزومند رہے۔

اقبالؔ کے بارے میں غور طلب اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں اس دنیا میں شاعری اور فلسفے کے حوالے سے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ان کے سماجی افکار کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ جبکہ اقبال کے نزدیک انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور انسانیت کی معراج کا ہدف اہم ہے۔ جس کے پیغام کے لئے انہوں نے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا، اور جس کی صداقت کی گواہی کے طور پر فلسفیانہ دلائل و براہین پیش کئے۔ ان کے نزدیک شعر و فلسفے کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال ایک فلسفیانہ ذہن اور شاعرانہ مزاج لیکر پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی ان دونوں خوبیوں او صلاحیتوں کو انسانی فلاح و عظمت کیلئے بروئے کار لایا۔ اقبال کے نقادوں نے اقبال کی دریافت کیلئے ان کے فلسفیانہ افکار کو لیکر بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ ان کے زمان و مکان کے تصورات فلسفے کے مختلف سکولوں سے متعلق ان کے خیالات سے خوب بحث کی ہے۔ لیکن اقبال کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کو فلسفیانہ عقدوں اور باریکیوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کی تمام تر کوشش یہ رہتی تھی کہ فلسفیانہ فکر و مباحث سے معراج انسانیت کے اعلیٰ مقصد کے حصول کیلئے کیونکر استفادہ کیا جائے۔ فلسفے سے متعلق ان کے یہ خیالات ہمارے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

یا

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

یا

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

یا

مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

اقبال فلسفے پر ہمیشہ عشق کو ترجیح دیتے رہے۔ ان کے نزدیک عرفان ذات کیلئے جہاں عقل انسانی عاجز ہو جاتی ہے وہاں سے عشق رہنمائی کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں فلسفے کا نچوڑ تصور "خودی" ہے اور ان کے شعر کا حاصل تعمیر "خودی" ہے۔

نقادوں نے فلسفی اقبال کے بعد شاعر اقبال کی دریافت کی ہے۔ اور ان فنی محاسن اور ادبی اجتہادات سے بحث کی ہے لیکن اقبال شاعری کو محض اپنے خیالات اور

پیغام کے ذریعہ اظہار کے لئے برتتے ہیں۔ تاہم اقبال نے اردو شاعری میں ایک مربوط فکر کا عنصر داخل کر کے اسے ایک نئی جہت اور وسعت دی ہے۔ جہاں تک روائتی اردو شاعری کا تعلق ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دور میں اپنے عروج تک پہنچی۔ میر اور غالب کے زمانے میں اردو شاعری نے فنی اعتبار کے لحاظ سے انتہاؤں کو چھولیا۔ بلکہ اکثر نقادوں کے نزدیک میر و غالب کے اندیشہ ہائے دور دراز کیلئے زمان و مکان کا تصور بھی ناکافی لگتا ہے اس میں کسی طرح کا اضافہ یقیناً کار دارد والا معاملہ تھا۔

اقبال نے جن موضوعات کو لیکر شاعری کی ہے وہ روائتی اردو شاعری کے موضوعات نہیں رہے ہیں۔ اقبال نے شاعری کو اپنے پیغام کی ترسیل کیلئے برتا اور اسے اپنے مربوط نظامِ فکر کا ذریعہ اظہار بنایا۔ بیشتر نقادوں کے مطابق اقبال نے جن سماجی اور فلسفیانہ مسائل کو لیکر شاعری کی ہے وہ ادبی مباحث سے تعلق نہیں رکھتے۔ یہ تو اقبال کے خونِ جگر کی آمیزش ہے کہ یہ موضوعات شاعری کے قالب میں اقبال کے ہاں اردو شاعری کو ایک بلند آہنگ ایک نیا لب و لہجہ، ایک نیا سوز فکر و معنی کی ایک وسیع دنیا اور ایک نیا ڈکشن ملا۔ انہوں نے شاعری کو زندگی کے مختلف روپ اور رنگوں سے روشناس کیا اور آنے والی نسلوں کیلئے اردو شاعری میں نئے امکانات کے در کھول دئے اور شاعری کئی معنوں میں جزو پیغمبری لگنے لگی۔

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

یا

نغمہ کجاو من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

یہ شعر عجم گرچہ طربناک ول دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبرئیل ہے یا بانگ سرافیل

شاعری کے حوالے سے اقبال کا رویہ یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کا پودا پھل (پیغام) کیلئے بویا۔ اب اگر اس سے پھول، پتے (جمالیاتی حظ) بھی حاصل ہوتی ہے وہ اس شاعری کے شجر کے اضافی فائدے ہیں۔

اب ہم شاعر اقبال اور فلسفی اقبال کے بعد سماجی مفکر اقبال کی طرف آتے ہیں۔ جہاں تک اقبال کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی افکار کا تعلق ہے ان میں ایک ارتقائی عمل ضرور ہے لیکن تضاد اور تبدیلی کہیں نظر نہیں آتی۔ اقبال فطرت کے شیدائی ہیں یہی رنگ ان کی شاعری اور خیالات میں اول سے آخر تک جاری رہتا ہے۔ ان کے ہاں وطنیت کا جذبہ شروع سے آخر تک اپنی پوری شدت کے ساتھ

رواں دواں رہتا ہے۔ "ہمالہ" اور "ترانۂ ہندی" سے لیکر "شعاعِ امید" تک وہ وطن کیلئے اپنی محبت کا خراج پیش کرتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
بھارت کے واسیوں کی مکتی بھی پریت میں ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

نوجوانی کے ان خیالات کے بعد اپنی عمر کے آخری حصے میں نظم "شعاعِ امید" میں جب سورج کی تمام کرنیں دنیا سے واپسی کا ارادہ کرتی ہیں تو ایک شوخ کرن سورج سے کہتی ہے۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کیلئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

یا پھر اقبال یوں بھی سوچتے ہیں

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

اقبال کے افکار میں اسلامی ضابطہ حیات کی خاص اہمیت تھی۔ انہوں نے اسلامی طرزِ حیات کی روح بازیافت کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی معاشرے کی کمزوریوں کی نشاندہی کی اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر زور دیا۔ اس سلسلے میں شاعری کے علاوہ خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ اہل اسلام علم و تحقیق کے معاملے میں مغربی دنیا سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اسلام کے عروج کے زمانے میں بھی مسلمانوں کا ذہنی سرمایہ دینی تعلیمات جہادی مہمات اور علم صرف و نحو اور شاعری رہا تھا۔ معاشیات، سیاست، سائینس اور سماجیات کی کارسازیوں اور باریکیوں سے واقف نہ تھے۔ وہ سماجی اشتراک اور تعاون کے رموز سے بھی واقف نہ تھے۔ عربوں کی طرزِ زندگی پر اسلام کے ظہور کے کافی بعد تک قبائلی زندگی کی سادگی کا اثر قایم رہا۔ جس زمانے میں کوفہ و بغداد علم و دانش کے مرکز تھے۔ اس دور میں بھی وہاں سائینسی، معاشی اور سیاسی علوم کا چلن نہ تھا۔ جبکہ عرب سے باہر کی دنیا میں زندگی نہایت پیچیدہ اور تہہ دار تھی۔ وہاں زندگی کے مسائل کو حل کرنے کیلئے سیاسی اور اقتصادی حل تلاش کئے جارہے تھے۔ اسی لئے عرب اپنے علاقوں سے باہر نکل کر وہ جوہر نہ دکھا سکے جو ان کا ضابطہ حیات ان سے تقاضا کرتا تھا۔ اقبال کیلئے عرب دنیا کی یہ حالت انتہائی صبر آزما تھی

وہ آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر دیکھ کر عرب دنیا کیلئے جو کہ اسلامی دنیا کی علامت سمجھی جاتی تھی کفِ افسوس ملتے تھے۔

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

امتِ مسلمہ کی حالتِ زار دیکھ کر اقبال ایک انوکھے انداز میں اپنا پیغام دیتا ہے ۔ نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس اپنے مشیروں کو مسلمانوں کے بارے میں نصیحت کرتا ہے۔

تم اسے بیگانہ رکھدو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ تاویلات میں الجھا رہے

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

فکر اقبال کیلئے سب سے بڑا چیلنج مغربی طاقتوں کا بڑھتا ہوا سیاسی و معاشی اثر و رسوخ تھا۔ جہاں مغرب میں ایک طرف انسانی اقدار دم توڑ رہی تھیں۔ وہاں سائینسی تحقیق اور ایجادات کو تخریب کاری کیلئے استعمال کیا جارہا تھا۔ حصول مقصد کیلئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا جارہا تھا۔ جنگ و جدل کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تیسری دنیا تو غلام دنیا تھی، یورپی قومیں باہمی تضاد اور ایک دوسرے پر سبقت لینے کیلئے آگ و خون کے دریا بہا رہی تھیں۔ اقبال اپنے دور کی سیاسی بساط کی منصوبہ بندی اور مہروں کی چالوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے پکار اٹھے۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ
یا پھر
تو نے دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ

اقبال مغربی دنیا میں یہودی قوم کے اثر و نفوذ کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔

تری دوا جینوا میں ہے نہ لندن
فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے

اقبال "جمیعت اقوام" جیسے عالمی اداروں کی حیثیت کو بھی اچھی طرح جانتے تھے جو سپر طاقتوں کے ہاتھوں میں محض کھلونا تھی۔ ایک تیکھا اندازِ بیان دیکھئے فرماتے ہیں۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے کہ خبر بدنہ میرے منہ سے نکل جائے

ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اقبال مغرب کی لادین سیاست گری اور اس کے نتائج سے بے چین تھے۔

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ نمیر

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کو فرنگی سیاست، علمی اجتہادات، اور سماجی افکار کے منفی پہلوؤں کا اندازہ تھا وہ مشرقی دنیا کو مغربی عزایم اور اندازِ فکر سے آگاہ رکھنا چاہتا تھا وہ مغربی طرزِ فکر کو مظلوم قوموں کیلئے ہی سمِ قاتل نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ مغربی سماج لئے بھی زہر ہلاہل سمجھتے تھے۔

ہوائیں ان کی فضائیں ان کی، سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ سمندر کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس
دنیا کو ہے معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اقبال کی فکر و دانش کے مختلف پہلو اجاگر کرنے کیلئے ہم نے ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں ان کی فکری رزم گاہوں اور بزم گاہوں کا جائزہ لیا ہے۔ عالم اسلام، یورپی انقلابات، مغربی سیاست کے ان کی فکر پر اثرات اور ان کا رد علم ان کے کلام کے حوالوں سے جاننے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اقبال نے مشرق و مغرب کی دنیاؤں کے اثرات ایک صحت مند سوچ کے ساتھ قبول کئے۔ انہیں اپنی علم و دانش کی روشنی میں جانچا پرکھا۔ ان کے متعلق اپنا رد عمل

ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ حل بھی پیش کیے۔ انہوں نے عالم انسانیت کو تہذیب حاضر کے منفی اثرات سے بچانے کیلئے بھی حل تجویز کیے۔ انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا احساس دلایا۔ اسے عرفان ذات اور انسانیت کی معراج کا سبق دیا۔ نئی تہذیب کے فرزندوں کو انسانی اقدار اور عالم بشریت میں ان کی اہمیت کا درس دیا۔ جدید علوم کے منفی اثرات، سیاست اور معیشت کے نئے حربوں اور انسانی زندگی پر ان کے منفی اثرات سے آگاہ کیا۔ وقتی اور عارضی فائدوں کے حصول کیلئے ابدی انسانی اقدار کی شکست وریخت کو ناقص انسانی تجربہ قرار دیا۔ یہ سب انہوں نے ایک مربوط فلسفۂ حیات سامنے رکھ کر اس کی روشنی میں کیا۔

اقبال کا فلسفہ خودی ان کی اسی تڑپ اور آرزوں کا مظہر ہے۔ اقبال نے عالم انسانیت کے شاندار مستقبل کے خواب بُنے اپنی نظم "مسجد قرطبہ" میں انہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب
عالم نوا ابھی پردۂ تقدیر میں ہے
میری نگاہوں میں اس کی سحر بے حجاب

اس سے آگے چل کر زندگی کے اندر مسلسل تبدیلی کے عمل کا مقابلہ کرنے کیلئے قوم کو مشورہ دیتے ہیں۔

صورتِ شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اقبال اس عالم نو جس کی سحر بے حجاب ان کی نگاہوں میں ہے کیلئے فلسفہ خودی پیش کرتا ہے۔ فلسفہ خودی کے مطابق انسانی زندگی میں خودی ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنی کمزویوں پر مکمل قابو پالیتا ہے۔ مقامات خودی تک رسائی حاصل کرنے کیلئے انسان کیلئے عشق و جنوں، استغراق، اور فقر شرطِ اول ہے۔ یہ انداز اسے زندگی کی فروعی حقیقتوں، ہوس و لالچ اور ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی لایعنی دوڑ سے نجات دیتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ فقر کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

فقر مقام نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

یا

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

حدیثِ بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد توبا زمانہ ستیز

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بڑی ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

زندگی سے متعلق دیگر علوم بھی اقبال کے پیشِ نظر رہے۔ اگرچہ ان کے دور میں انسان نے موجودہ سطح تک کائنات کے اسرار رموز آشکارا نہیں کیے تھے۔ اور نہ ہی اس حد تک خلائی تحقیق اور مواصلاتی انقلاب آیا تھا۔ لیکن اقبال کے سامنے ستاروں سے آگے کے جہانوں کے امکانات موجود تھے۔ لیکن انسانی علوم کی بے بسی اور کم مائیگی ان کے پیشِ نظر تھی۔ وہ علمِ نباتات کے حدود کو جانتے تھے۔ لہذا سمندروں کو کھنگالنا یا ستاروں کی خاک چھاننا ان کے نزدیک انسانی معراج نہ تھا۔ ٹھوس چیزوں کے تجزیے اور مادی اور طبعی دنیاوں کی چھان پھٹک اگرچہ انسانی ترقی کا ایک زینہ ضرور تھی لیکن انسانیت کی معراج اور عرفان ذات کا ہدف خاصا دور تھا۔ اقبال اپنے فلسفۂ خودی کے ذریعے انسان کو ان ماورائی طاقتوں پر غلبہ پانا سکھا رہا تھا جن کا انسانی زندگی میں بے پناہ عمل دخل ہے لیکن وہ کھلی آنکھوں اور حسیات کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ وہ طاقتیں انسانی زندگی کے بناؤ سنگھار میں بنیادی محرک کے

طور پر استعمال ہوتی ہیں لیکن اس کے قبضے سے باہر ہیں۔ اقبال انسانی خودی کی جولانگاہ میں جبرئیل واسرافیل کو اسیر دیکھنا چاہتا تھا۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

"خودی" کے مراحل طے کرتے ہوئے انسان جن تجربات سے گذرتا ہے ان کا بیان اقبال ان اشعار میں کرتے ہیں۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

ان مقامات سے گزرتے ہوئے بندہ مومن کو اسی دنیا اور آخرت میں اپنی سلطانی نظر آتی ہے اور

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

اس مقام کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی

اقبال کی فکر کا یہ مظاہرہ ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ ان منازل کو طے کرنے کیلئے انسان کو مقامِ عقل سے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ چاہئے۔ اور خود اقبال

مقام عقل سے آسان گذر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

یہاں تک آتے آتے فکر اقبال کی تہیں اور پرتیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان کے مطابق یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ اقبال اپنے دور سے بہت آگے مستقبل میں جھانک رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مغربی تہذیب وافکار کا رخ کس سمت ہے اور اس کے ممکنہ نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے مغربی دنیا کے انقلابات اور پہلی جنگ عظیم کے اسرار رموز اچھی طرح دیکھ لئے تھے اور اس جنگ کے بعد مغربی ممالک کی سوچ اور عزائم کو بھانپ لیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یورپ کی تہذیب خود اپنے ہی خنجر سے خود کشی کرے گی۔ جسکا نظارہ عالم انسانیت نے دوسری جنگ عظیم کے دوران کھلی آنکھوں سے کیا۔ مغرب سے لیکر مشرق بعید تک انسانیت خون میں لت پت ہوئی۔ مغربی فکر و نظر میں اس بھیانک تخریب کاری کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ بلکہ تجارت اور سیاست کے کھیل میں وہ ابلیسی ہتھکنڈے زیادہ شدت سے آزمائے جارہے ہیں۔ سائنسی اور سماجی علوم کی ترقی سے اخلاقی اور مذہبی دنیا پر دوررس اثرات پڑے ہیں۔ خلائی تحقیق، زراعت اور مواصلات کے علوم میں حیرت انگیز ترقی نے انسانی سماج اس کی سوچ اور طریق کار پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اب سیاست کی چالیں زیادہ پیچیدہ منصوبوں اور زیادہ باریک انداز میں چلی جارہی ہیں۔ غلامی کا تصور بدل چکا ہے۔ استحصالی حربے بدل چکے ہیں۔ اب انسان کی ہر خوبی اور ہر کمزوری کا متفی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتیں ایک منصوبہ ساز عمل کے ذریعے عالمی نظام مرتب کرتی ہیں۔ عصر حاضر کی بڑی طاقت باقاعدہ اقوام عالم کو

اپنے new world order کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ اقوام عالم کی صف بندی کی جاتی ہے۔ مشرق و مغرب کی جو اقوام مزاحمت کی جرأت کرتی ہیں انہیں مختلف حربوں سے شرمناک سمجھوتے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

اقبال کے افکار کی دنیا تا ہنوز پردۂ راز میں ہے۔ اقبال کی فکر اپنے دور میں بھی مطلوبہ نتائج برآمد نہ کر سکی اور آج بھی ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے دور کے فوراً بعد دنیا حرب و ضرب اور جنگ و جدل کے دور میں داخل ہو گئی۔ جس کی اپنی ایک منطق تھی اور جنگ کے بعد صورت حال نے نئے انداز میں ترتیب پائی۔ حالات کی تبدیلی میں اسقدر جدت اور ڈرامائیت تھی کہ دنیا میں غور و فکر کرنا، فلسفوں کی تعبیر تلاش کرنا یا اصول و اقدار کی بات کرنا پہلی اور دوسری دنیا کی ترجیحات میں نہ تھا۔ یوں بھی زندگی میں انقلابات سماجی مفکرین کے فلسفے سے برپا نہیں ہوتے بلکہ "اجتماعی" کشمکشِ حیات" بڑی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے۔ جس کی مثال یورپی قوموں کے انقلابات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں تک اقبال کی دنیا کا تعلق ہے جس میں ہندوستان اور عرب دنیا بالخصوص شامل ہے۔ اس میں کشمکشِ حیات میں اس قدر شدت نہ تھی کہ کسی فلسفے کی بنیاد پر کوئی تبدیلی رونما ہوتی۔ بلکہ اقبال کی دنیا ایک مغلوب دنیا تھی اور یہ صورت حال کم و بیش ہنوز باقی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اقبال اپنے دور سے بہت پہلے پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان کا اندازِ بیان اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اور زمانے کے ساتھ چلنے کا تھا۔ لیکن بڑی باریک تھی مغرب کی چالیں، جن کی وجہ سے اقبال کے افکار کیلئے مناسب ماحول پیدا نہ ہو سکا۔

جدید ذہن اور غور و فکر کی دنیا میں اقبال کی فکری معنویت روز افزوں بڑھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے مغلوب قوموں میں کشمکشِ حیات کیلئے اقبال کا جوش جنوں چاہئے۔ ان کیلئے یقین محکم اور عملِ پیہم چاہئے۔ ان کے اندازِ فکر میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن مغلوب قومیں اپنے موجودہ وسائل اور ذہنی رویّوں کی بنا پر کسی انقلاب کی متحمل نہیں ہو سکتی ہیں۔ آخر میں ہم اقبال کے الفاظ میں اقبال کی قوم کو یہ دعا دیں گے کہ

خدا تمہیں کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت

شکیل شفائی

اس دنیائے آب و گل میں ہر جاندار اور متحرک چیز کا ایک مخصوص مزاج، چند نمایاں خصوصیتیں اور ابھرے ہوئے خدوخال ہوتے ہیں۔ جن سے اس کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ پھر یہی مزاج، خصوصیتیں اور خدوخال اس کی صفاتِ مابہ الامتیاز قرار پاتی ہیں۔ اس میں افراد، جماعتیں، ملتیں اور قومیں نیز مذاہب اور فلسفے یکساں طور پر شریک ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اکیسویں صدی میں اقبال کے فکر کی معنویت پر خامہ فرسائی کرنے سے پہلے اس امر کی وضاحت کریں کہ اقبال کی فکری ساخت کیا تھی؟ کیونکہ جب تک ہم یہ جان نہ لیں کہ اقبال کا فکر و نظر کیا تھا۔ اس کی زندگی کس مرکزی نقطہ کے گرد محوِ گردش رہی تب تک اس کے فکر کی معنویت پر خامہ زنی نہیں کی جا سکتی۔

ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے ارتقائی سفر میں مختلف افکار و نظریات کے

حامل رہے۔ لیکن آخر میں وہ اس بات کے قائل ہوگئے تھے کہ انسانیت کے تمام دکھوں اور غموں کا مداوا اور انسانی زندگی کے سفر میں پیش آمدہ تمام مسائل کا حل اسلامی نظامِ حیات میں پنہاں ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن ہی انسانیت کے جوہر کو نکھارتا ہے۔ لیکن ایسا انہوں نے اس لئے نہیں کیا کیونکہ وہ عقیدتاً مسلمان تھے بلکہ اپنے عمیق غور و فکر اور سالہا سال کے مطالعے نے ان کو اس نتیجے پر پہنچادیا تھا کہ زندگی کے بارے میں جتنے بھی نظریات انسان نے اپنے زورِ مطالعہ اور طویل غور و فکر کے بعد ایجاد کئے ہیں وہ ناقص و نامکمل ہیں اور اسی کے ساتھ تغیر پذیر دنیا میں وہ وقت کی رفتار کے ساتھ از خود نقشِ پارینہ بنتے چلے جائیں گے اور انسانیت پھر سے تباہی کے لبِ بام پر آکھڑی ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسانی زندگی کو ایک ایسا نظام فکر و عمل مہیا کیا جائے جو زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ اس طرح دے سکے کہ اس کی اپنی روح ختم نہ ہونے پائے۔ اس میں اتنی لچک ہو کر ہر زمانے کی ضرورتوں اور اس کی وسعتوں کا ساتھ نبھا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مثنوی، "اسرار خودی" کے دیباچے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "میری مثنوی کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ میں دراصل ایک بہتر انسانی سماج کی تلاش میں دلچسپی رکھتا ہوں لیکن اس تلاش میں ایک ایسے سماجی نظام کو کیسے نظر انداز کردوں جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ نسل، ذات پات، رنگ کے فرق کو یک قلم مٹادے۔"

یہ نظام فکر و عمل کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ انسان اپنی تمام تر خوبیوں اور صلاحیتوں کے اپنے فکر و نظر، عمیق اور گہرے مطالعہ اور دیگر انسانی خصوصیتوں کے باوصف ایک محدود دائرے میں برسرِ پیکار رہتا ہے۔ وہ ماضی

اور حال کا تجزیہ تو کر سکتا ہے۔ مگر مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ انسانی زندگی ریاضی کے اصول و قوانین کی پابند نہیں جن کو بروئے کار لا کر مستقبل کے بارے میں کوئی صحت مند پیشن گوئی کی جاسکے یا ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جاسکے۔ جو آئندہ پیش آنے والے حالات و مسائل کا کلی احاطہ کرے اور ان کا صحت مند حل پیش کر سکے۔

یہ کوششیں اگرچہ اب تک کئی انسانوں نے کی لیکن تاریخ نے ان کو جھٹلایا اور وہ اپنی پیدائش کے سو سال کے اندر ہی نقشِ پارینہ ہو گئے۔ اپنے ذاتی فوائد کیلئے کسی نے ان کو گلے کی مالا بنا رکھا ہو تو دوسری بات ہے البتہ علمی، تحقیق اور عملی سطح پر وہ نظریات ناکام ثابت ہوئے۔ ان میں زندگی کے مسائل کا کوئی پائیدار حل نہ مل سکا۔ بلکہ الٹا ان سے زندگی کے مسائل دوچند ہوئے اور انسانیت کے درد و الم اور اندوہ و غم میں چند در چند اضافہ ہی ہوا۔ اس کی تازہ ترین مثال سوشلزم ہے جس کے بارے میں بڑے زور و شور سے یہ دعویٰ کیا گیا کہ مارکس اور اینجلز نے اپنے طویل مطالعہ اور غور و فکر کے بعد زندگی کا سب سے بہتریں اور پائیدار نظام فکر و عمل ترتیب دیا ہے جواب رہتی دنیا تک نسخہ کیمیا اکسیر کا کام دیگا۔ کیونکہ انسان ارتقائی سفر کا بھی لابزمی نتیجہ یہی ہے۔ اس لئے اب انسانیت کی فلاح و کامرانی اس بات میں مضمر ہے کہ سوشلزم اختیار کیا جائے۔ لیکن یہ دعویٰ ایک صدی کے اندر اندر ہی کھوکھلا ثابت ہو گیا۔ نہ صرف علمی اور تحقیقی لحاظ سے بلکہ عملاً بھی سوشلزم ایک ناقص نظریہ ثابت ہو گیا جس میں انسانیت کیلئے تباہی اور بربادی تو ہو سکتی ہے کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ پس لازم ہے کہ ایک ایسا نظام فکر و عمل دریافت کیا جائے جو اٹل اور حتمی ہو

اور قوانین تغیرات سے ماورا ہو۔ ایسا نظام فکر و عمل بس اسلامی نظام حیات ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اسلامی نظامِ زندگی جس اصولوں اور قوانین پر تشکیل دیا گیا ہے وہ کسی انسان کے دریافت کردہ نہیں ہے بلکہ خالق کائنات خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ خدا تعالیٰ ہی انسان کے مسائل کیلئے بہترین حل مہیا کر سکتا ہے کیونکہ انسان خدا کی تخلیق ہے اور جو جس چیز کا خالق ہو سہی اس چیز کی ترقی اور نشوونما کیلئے بہترین لائحہ عمل تیار کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مغربی تہذیب، اشتراکی نظریوں اور دیگر غیر اسلامی افکار و خیالات کو رد کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ تہذیب و تمدن اور نظریہ ہائے حیات نری مادی اصولوں پر قائم و دائم ہیں۔ یہ بظاہر انسانیت کے غمخوار نظر آتے ہیں مگر پس پردہ تاجروں کی منڈیاں اور ساحروں کی فسوں کاریاں ہیں جن میں انسانیت کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ اس کا سودا کیا جاتا ہے اور غلامی اور بندگی کے جالوں میں پھانس دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں مغربی تہذیب قلب و نظر کا فساد ہے اس کے تمدن سے روح بالیدگی اور پاکیزگی حاصل نہیں کر سکتی۔ ان کے خیال میں اگر روح میں بالیدگی، و پاکیزگی کا عنصر ہی ختم ہو جائے تو ضمیر کی پاکی، خیالات کی بلندی اور ذوقِ لطیف بھی ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ نہ سکی عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اقبال کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب میں حکومتوں کی وسعت اور اقتدار کے باوجود ایک بے چینی اور اضطراب کا دائمی احساس موجود رہتا ہے، عیش وعشرت کی زندگی ہر طرف نظر آتی ہے مگر دلوں میں روشنی کی کرن موجود نہیں۔

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور ہیں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادی ایمن نہیں شایان تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہو کلیسا کے یہودی متولی

اقبال کا کہنا ہے کہ لادینی تہذیب کی بنیاد و اساس ہی دین واخلاق کی بیخ کنی ہے۔ ہر زمانہ میں مادیت کے بتکدوں میں نت نئے بت تراشنا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ لادینی تہذیب سدا ہی اہل حق کے ساتھ برسرپیکار رہی ہے۔ دل اس کے جادو سے بے بصیرت اور روح تشنہ ہو جاتی ہے۔ یہ وہ باہمت راہزن ہے جو دن دھاڑے ڈاکے ڈالتا اور متاع ایمان لوٹ کر لے جاتا ہے۔

لیکن از تہذیب لادینی گریز
زاں کہ اور بااہل دل دارد ستیز

فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آمد
لات و عزیٰ در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر
روح از بے آبیٔ او تشنہ میر
لذت بے تابی از دل می برد
بلکہ دل زیں پیکر گل می برد

وہ کہتے ہیں کو یورپ مقام حق سے باخبر نہیں ہے نہ اس کے پاس نور بصیرت ہے۔ جو اللہ کے نور سے مستیز ہوتی ہے تاکہ یہ حقائق زیست کا مشاہد کر سکتے نہ اس کو حلال و حرام کا اندازہ اور نہ اس کی حکمت میں پختگیٔ و پائیداری، یہ تاجر قوم ہے۔ اس تہذیب کے ہوتے ہوئے امن واطمینان اور محبت و آشتی کا وجود ممکن نہیں۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست
چشم او ینظر بنور اللہ نیست
اور نہ نداند از حلال و از حرام
حکمتش خام است و کارش ناتمام
امتے بر امتے دیگر چرد
دانہ این می کارد آن حاصل برد
از ضعیفان ناں ربودن حکمت است
از تن شان جان ربودن حکمت است

مغربی تہذیب کا شعار آدمیت کو لوٹنا ہے اور یہ سب کچھ تجارت کے خوشنما

طریقوں سے انجام دیا جاتا ہے۔ یہ چالاک یہودی ذہنیت کی سازش ہے کہ انسان کا دل نورِ حق سے محروم ہو جائے۔ جب تک یہ نظامِ فکر و عمل تہہ و بالا نہ کر دیا جائے، دانش و تہذیب و مذہب ایک خام خیال سے زیادہ کچھ نہیں۔

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں نبوک ایں فکر چالاک یہود
نور حق از سینہ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردو ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

اقبال فرماتے ہیں کہ یہ تہذیب اپنی طبعی عمر پوری کر چکی ہے۔ اب قریب ہے کہ یہ اپنی موت آپ مرے اور اگر بالفرض یہ اپنی موت آپ نہیں مرتی تو بھی یہ بات یقینی ہے کہ یہ تہذیب اپنے ہی خنجر سے اپنا کام تمام کر دے گی۔ اس کی اساس نہایت ہی کمزور اور غیر مستحکم ہے۔ یہ حالات و حوادث کے سنگین حملوں کا تاب نہیں لا سکتی۔ یورپی تحقیقات خود اس کے حق میں اب ایک چیلنج بن چکی ہیں۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

اقبال کہتے ہیں کہ بظاہر یورپ میں علم و ہنر کی روشنی بہت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کو زندگی عطا نہیں کر سکتے کیونکہ اس تہذیب کے عناصر تخلیقی میں روحانی عنصر غائب ہے۔ یہاں مادیت کا غلبہ ہے اس لئے بنکوں کی عمارتیں گرجوں سے بلند اور وقیع ہیں۔ انہوں نے تجارت کے نام سے جوئے کی منڈیاں قائم کی ہیں جو سودی نظام کی پروردہ ہیں اور ان کا مقصد انسانیت کی موت ہے۔

مغربی تہذیب انسان مساوات کا بلند بانگ دعویٰ کرتی ہے مگر ان کے علم و تدبر اور حکمت کا ہدف و نشانہ انسانیت کا لہو ہے جسے چوس چوس کر یہ اپنے تن بدن کو خوشنما اور فربہ کرتے ہیں۔ اس تہذیب نے انسانی زندگی کے مسائل سلجھانے کے بجائے الجھائے ہیں۔ چنانچہ بیکاری، عریانی، شراب خوری اور غریبی اس کی بڑی بڑی تصویریں ہیں۔ جو قوم بھی آسمانی ہدایت سے محروم ہو وہ برق و بخارات میں کتنی ہی ترقی کر جائے۔ در حقیقت وہ پوری نوعِ انسانیت کیلئے مہلک اور مضر ثابت ہوتی ہے۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

مغربی تہذیب و تمدن پر تنقید و تجزیہ کیلئے ان کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں بہت سی تحریحات ملتی ہیں۔ وہ مغرب کی مادی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ مسائل اور مشکلات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ یعنی وہ اپنے ضمیر و باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے

نظر ڈالئے تو افراد افراد سے دست و گریباں ہیں۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کیلئے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ در حقیقت زندگی سے ہی اکتا چکا ہے۔ اس کی نظر حقایق پر ہے یعنی اس کے اس سر چشمے پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے لہذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے اور پھر جیسا کہ ہکسلے کو بھی خدشہ تھا اور جس کا بتاسف وہ اظہار بھی کر چکا ہے۔ مادیت کی اس باقاعدہ نشوونما نے اس کے رگ و پے بھی مفلوج کر دئے ہیں۔ کچھ ایسی ہی حقیقت مشرق کی ہے۔ عصر حاضر کی لادینی اشتراکیت کا مطمحِ نظر بیشک نسبتاً زیادہ وسیع ہے اور اس کے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا، لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے انتہا پسند متبعین پر ہے لہذا وہ اس چیز سے برسر پیکار ہے جو اس کیلئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔ بہر حال یہ وطنیت ہو یا لادینی اشتراکیت دونوں مجبور ہیں کہ بحالت موجودہ انسانی روابط کی دنیا میں تطابق و توافق کی جو صورت ہے اس کے پیش نظر ہر کسی کو نفرت، بدگمانی اور غم و غصے پر اکسائیں۔ حالاں کہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔ جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی

کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس میں باہم دگر مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ نہ اس تہذیب و تمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ (۹۳۔۲۲۰)

ڈاکٹر صاحب مغربی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغربی معاشرے میں ترقی اور حرکت طبقاتی کشمکش اور اونچ نیچ کی خونریزی کے بغیر ممکن نہیں۔ سیاسی اقدار کی دین سے علیحدگی نے ایک عجیب وحشیانہ صورت حال پیدا کی ہے اور اجتماعی فکر و عمل کی وحدت کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔ اقبال سرمایہ داری اور اشتراکیت کو مادیت کی دو شکلیں سمجھتے ہیں جو مکانی بعد رکھنے کے باوجود مادی اور محدود انسانی نقطہ نظر رکھنے میں مشترک ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ روحانی اقدار کو اب مغرب معدے میں تلاش کر رہا ہے۔ اور بطن معدہ سے آگے اس کی نظر نہیں جاتی۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب کے پاس پیغمبری صداقتیں نہیں ہیں اس لئے وہاں اخوت، باہمی محبت، مودت، انسانی مساوات اور ہمدردی، قلبی لگاؤ اور روحانی دل بستگی جیسے جذبات و خیالات پنپ نہیں سکتے کیونکہ جذبات کی بنیاد اور اساس روحانی اقدار ہے اور مغربی معاشرہ روحانی قدروں سے یکسر خالی ہے۔

غریباں گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جان پاک را

رنگ و بو از تن نہ گردد جان پاک
جذبہ تن کارے ندارد اشتراک
دین آن پیغمبر حق نا شناس
بر مساوات شکم دارد اساس
تااخوت را مقام او دل است
بیخ او را دل نہ در آب و گل است

(جاوید نامہ)

اس طرح ملوکیت اور اشتراکیت خدا بیزاری، استحصال، مادی نقطہ نظر، اضطراب و انتشار، ظلم و ستم، فحش و عریانی خود غرضی و مکاری اور انسانیت کو غارت و برباد کرنے کے نقطے پر آکر مل جاتے ہیں۔ زندگی اشتراکیت میں اگر خروج ہے تو ملوکیت میں خراج ہے۔ محروم انسان ان چکیوں کے بیچ میں بے کسی اور کسمپرسی کی حالت میں پستا اور کچلتا جارہا ہے۔ اشتراکیت ایک خراج ہے۔ محروم انسان ان چکیوں کے بیچ میں بے کسی اور کسمپرسی کی حالت میں پستا اور کچلتا جارہا ہے۔ اشتراکیت ایک طرف علم و فن اور دین و اخلاق کی جڑ کاٹ رہی ہے۔ اور ملوکیت دوسری طرف عوام کے خون کی پیاسی بنی ہوئی ہے۔ یہ دونوں مادی لذتوں میں غرقاب ہیں۔ ان کا جسم تازہ مگر قلب ظالم، فاجر اور بے نور بصیرت ہے۔

ہر دو راجاں نا صبور نا شکیب
ہر دو یزداں نا شناس آدم فریب

زندگی ایں را "خروج" آن را "خراج"
درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دورا در آب و گل
ہر دوراتن روشن و تاریک دل

(جاوید نامہ)

اقبال کی دور رس نگاہوں نے پہلے ہی اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ مغربی استعمار سیاسی ہتھکنڈوں کے علاوہ تعلیمی میدانوں میں بھی سحر کاری سے کام لیگا۔ اس لئے اقبال نے مغربی نظام پر بھی زوردار تنقید کی اس کی خرابی کو واشگاف کیا۔ اقبال کی نظر میں مغربی تعلیم ایک فرسودہ نظام تعلیم ہے جس کا مقصد لوگوں کو ایک خاص سانچے میں ڈالنا ہے۔ یہ سانچہ مغربی استعمار کا تیار کردہ ہے اس سے لوگوں کی ذہنیت بدل جائے گی۔ اپنی تہذیب و تمدن پر ان کا اذعان و یقین اٹھ جائے گا۔ وہ مغرب کے دست نگر ہوں گے اور مغرب کے اشاروں پر ہی زندگی گذاریں گے۔ یہی چیز مغربی استعمار کو مضبوط کر سکتی ہے اور ایسے ہی افراد سے مغربی سامراج کی بنیادیں پختہ ہو سکتی ہیں۔

اکبر مرحوم نے اس حقیقت کو ایک شعر میں خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے

مشرق تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اقبال اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ ازوے روح قومی می تواں گشت

تعلیم میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ انسان کی ماہیت بدل دیتی ہے۔ وہ انسان کے شعور و وجدان میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اقبال کہتے ہیں کہ مغربی تعلیم انسانی دین و مروت اور اخلاق و آداب کے خلاف ایک سازش ہے

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
اک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال نے مغربی نظام تعلیم ے بحر ذخار میں غوامی کی تھی اور خوش قسمتی سے وہ ایمان کی سلامتی اور روح کی پاکیزگی کے ساتھ باہر نکل آئے۔ اقبال نے مغربی نظام تعلیم کی جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا اور جن سے امت مسلمہ کو بچانا چاہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اس نظام کے مفاسد کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا۔ یہ صرف نظریاتی بحث نہیں تھی بلکہ تجربہ کی بناء پر حاصل گئی قلبی روشنی تھی۔ مغربی افکار اور مغربی نظام تعلیم نے اقبال کا یقین اس بات پر مزید مستحکم کر دیا تھا کہ جس تعلیم کے اجزاءِ ترکیبی میں قرآن و سنت کی آمیزش نہ ہو یا جو شجر تعلیم قرآن و

سنت سے آبیاری حاصل نہ کرے وہ انسانیت کیلئے مادی نقطہ نظر سے کچھ فائدہ مند ہو تو اخلاقی اور روحانی موت کا سبب یقینی بن جاتا ہے۔ جس سے امتیں ہلاکت و بربادی کی آماجگاہ بنتی ہیں۔ ان میں ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جو مادی اور دینوی فوائد کو روحانی اوصاف و اخلاقی اقدار پر ترجیح دیتے ہیں۔ جس سے بے اعتمادی، باہمی تنفر، خود غرضی، ظلم و استحصال، جبر و تشدد جیسی اخلاقی رزائل جنم لیتے ہیں۔ مغربی شجر تعلیم نے سدا ہی ایسے ہی برگ و بار لائے ہیں۔

اقبال نے جہاں مدرسہ اور طالب علم کے جرم کا ذکر کیا ہے وہاں بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم مغربی مدارس اور ان کے طلبہ مراد ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کے حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے۔ اقبال مدرسہ و خانقاہ دونوں سے بیزار نظر آتے ہیں جہاں نہ زندگی کی چہل پہل ہے نہ محبت کا جوش و خروش نہ حکمت و بصیرت نہ فکر و نظر۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

وہ مدرسوں کی کور باطنی اور بے ذوقی اور خانقاہوں کی بے التفاتی اور کم توجہی دونوں سے نالاں نظر آتے ہیں۔

جلوتیاں مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیاں میکدہ کم طلب و تہی کدو

اقبال کا کہنا ہے مغربی دانش گاہوں نے عقل کی آبیاری کی مگر روح کو تشنہ ہی چھوڑا۔ انہوں نے ظاہر پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کی مگر روحانی پہلو سے صرف

نظر کر گئے۔ چنانچہ جو طلبہ ان دانش گاہوں سے فارغ ہو کر نکلے ان کے ظاہر و باطن عقل و روح اور قدیم و جدید میں ایک وسیع اور لامتناہی خلیج ابھر آئی۔

اکیسویں صدی محض خیر کا پیغام نہیں بلکہ ظلم و ستم کا بھی پیغام سنا رہی ہے۔ ظاہر ہے اس کا شکار بیچاری انسانیت ہی ہو گی۔ اس لئے کہ ٹکنالوجی سے لیس۔ دولت سے ہمکنار اور مادیت کے سیلاب عصیاں میں غرق مادی طاقتوں کو آپ کی مادی ترقی سے نہیں بلکہ آپ کے پیغام، آپ کی اقدار، آپ کے اصول اور نظریات سے لرزہ طاری ہے۔ اس لئے وہ اس امر میں جی جان کی بازی لگادیں گے کہ آپ کو حق کی معرفت حاصل نہ ہو۔ ابلیس نے ہمیشہ یہی پیغام اپنی ذریت کو دیا ہے کہ اس امت کو اس انقلابی فکر و نظر، جس کے اقبال ہندی ترجمان ہیں، تک نہ پہنچنے دیا جائے جس کا اسلام داعی ہے۔

دراصل اقبال کا فکر وہ وظیفہ ہے جو مومن کو مسلسل جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ مسلمان کبھی کاہل اور سست گام نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا کردار ہمہ دم رواں دواں سیلاب کی مانند ہے۔ مسلمانوں نے اگر اس فکر کو بھلادیا تو وہ خود اپنی دنیا و آخرت برباد کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اگر یہ امت فکر اقبال، جو در حقیقت مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر ہے، سے وابستہ رہی جس طرح اس سے وابستہ رہنے کا حق ہے تو دنیا ایک اور صالح انقلاب کا مشاہد کریگی جس طرح وہ ماضی میں کر چکی ہے۔

نوٹ: یہ مضمون کافی طویل تھا۔ یہاں اسکی تلخیص پیش کی گئی۔ مکمل مضمون کو الگ سے چھاپنے کی کوشش کی جائیگی۔

اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت

غلام محمد خان ۔گوجرہ بڈگام

اس موضوع پر بحث کرتے وقت ہم کو اس بات کا لحاظ کرنا ضروری ہے کہ جس طرح دنیا کا کوئی بھی عظیم مفکر، دانشور، شاعر، فلسفی زمان و مکان کی سرحدوں کا پاس نہیں کرتا اسی طرح علامہ اقبال بھی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ اس جیسی بصیرت افروز شخصیات زمانہ ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ہی جگہ سمیٹ کو تصور ماورائے زمان کو تخلیق کرتی ہیں۔ اور بلا لحاظ مذہب، ملت، قوم، رنگ انسانیت کی رہنمائی کرتی رہتی ہیں۔ شخصیت کی عظمت کا راز اسی بات میں پنہاں ہے کہ وہ کس حد تک تہذیب و تمدن کے اوراق پر اپنی فکر کے اثرات ثبت کر سکے اور کس حد تک آنے والی نسلیں اس کے فرمودات کی خوشہ چینی کرتی رہیں گی۔

اقبال نے زندگی کا وہ فلسفہ کر کے دکھادیا جو تخلیات کے پردوں کو چیر کر عملی میدان سے ہم کو آشنا کراتا ہے۔ انہوں نے زندگی کو تصور سود و زیاں سے اٹھا کر اس کو

لافانی اور ابدی تاثرات سے مالامال کیا۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اقبال کی فکر و شاعری کو ہم شیکسپیر کے الفاظ میں ابدی خطوط (eternal line) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ خطوط لامحدود اور لامتناہی ہیں اور یہ سالہا سال تک انسان کو انسانیت کی صحیح نشاندہی کرتے رہیں گے۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبرئیل ہے یا بانگ سرافیل

اقبال کا یہ پیغام ابدی اور آفاقی ہے۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے گذر کر عصبیت کی تنگ و تاریک حصار سے نکل کر ایک فلاحی سماج کی تشکیل پر ختم ہوتا ہے۔ ایسا مثالی معاشرہ جس اس دنیاوی زندگی کا ماحصل ہے۔ جو تخلیق آدم کا نتیجہ ہے جو ہر فرد کی خودی کا نگہبان ہے۔ اس معاشرے کا ہر فرد ایک مثالی آدم کی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ زماں و مکان کا قیدی نہیں ہوتا بلکہ اس کی شخصیت کی شعاعیں مادیت کی حصار کو چیر کر ابدیت کا لباس پہن کر عالم انسانیت کی رہبری کرتی رہتی ہیں۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی ہے نہ صفاہاں نہ سمر قند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اقبال کی نظر انسانی ادراک کی سرحدوں سے گزر کر نئی نئی بستیاں تلاشتی ہے۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

وہ غالبؔ کی طرح قدرت کی عطا کردہ امکانی کائنات کو ایک جست میں ہی طے کر کے نئی منزلوں کی سیاحت کیلئے جستجو کرتا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکان کو اک نقش پا پایا

اقبال اس سماج کی تشکیل کے خواہاں تھے جو فرد کی انفرادیت (individ-uality) کو بھی قایم رکھے لیکن ساتھ ساتھ معاشرتی نظام میں یکسانیت پر بھی کوئی آنچ نہ آنے دے۔ اس مثالی سماج کی تشکیل کیلئے انہوں نے عمر بھر سعی و کوشش کی اور اس مقصد کیلئے اپنی تمام زندگی کو وقف کیا۔ یہی خلوص ان کو عملی سیاست میں بھی کھینچ لایا۔ ورنہ ان کی عارفانہ طبیعت سیاسی شعبدہ بازی کیلئے بالکل موزوں نہ تھی۔ لیکن وہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے سیاسی تجربات سے مستفید ہونا چاہتے

تھے۔

اس بات کو ذہن نشین کرنا بہت اہم ہے کہ اقبال کسی خاص طبقے کا شاعر نہیں ہے۔ کسی خاص مذہب یا ازم سے قاری کو متعارف نہیں کرتا بلکہ وہ رواں دواں آفاقیت کا راگ الاپ رہا ہے۔ وہ انسان کو فکر و عمل کی تعلیم دیکر اس کی خوابیدہ روح کو جگانا چاہتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ سماجی تبدیلی رونما ہو اور انقلابی روح کو بیدار کیا جائے

ندرتِ فکر و عمل کیا شئے ہے ذوق انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شئے ہے ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارہ لعلِ ناب

اقبال کا پیغام سراسر دعوت فکر و عمل ہے اس طرح کا اپروچ انگریزی شاعری میں رومانٹسزم (Ramanticism) کے بالکل قریب رہا ہے۔ جس طرح ورڈس ورتھ (Wordsworth) شیلے (Shelly) کیٹس (Keats) کی شاعری میں قاری فطرت کے پر اسرار نظاروں میں کھو کے رہ جاتا ہے اسی طرح اقبال کی شاعری میں اول سے آخر تک انسان کو اپنی حقیقت سے شناسائی۔ مناظر فطرت میں غور و فکر کرنے سے آتی ہے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ

لیام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ لیام میں آج اپنی ادا دیکھ

اقبال انسانی ضمیر کو جھنجوڑنا چاہتے تھے۔ وہ انسان کو اپنے منصب و مقام سے باخبر کرنا چاہتے تھے۔

آدمیت احترام آدمی　　باخبر شو از مقام آدمی

وہ جہاں "جاوید نامہ" میں معراج انسانیت کیلئے رہنما اصول کی وضاحت کرتا ہے، وہاں "زبور عجم" میں عجمیوں کو ان کے تابناک ماضی کی داستان سنا کر احیائے فکر و عمل کیلئے ایک صحیفہ چھوڑ دیتا ہے۔

چو ں چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم جان من و جان شما
غوطہ ہازد در ضمیر زندگی اندیشہ ام
تابدست آوردام ام افکار پنہان شما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت

رنگم طرح حرم در کافرستان شما
میرسد مردی کہ زنجیر غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما

وہ ماضی، حال اور مستقبل کے ارتباط کے تسلسل کا شدت سے احساس رکھتے تھے۔

زندہ فرد از ارتباط جان و تن
زندہ قوم از حفظ ناموس کہن
مرگ فرد از خشکی رود حیات
مرگ قوم از ترک مقصود حیات

وہ زندگی کی ندی کو سیراب رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے ایلوس (alleyes-sus) کی طرح علوم آگہی کے چشموں سے پانی پی کر بھی اپنی پیاس نہ بجھا سکے۔ بلکہ تجسس اور جستجو کے تپتے صحراؤں اور ریگستانوں میں آب حیات کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ان کی کتابیں۔ (شعری مجموعے) انہی عنوانات سے تعبیر ہیں۔ بانگ درا، بالِ جبرئیل اور ضربِ کلیم ان کے نام سن کر ہی قاری کا ذہن اس مسافر کی طرف جاتا ہے جو منزل مقصود کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہے۔ اور جس کی روح کسی چیز کے پانے کیلئے تڑپ رہی ہو۔

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثال نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

یا اپنے بیٹے کے نام یہ پیغام

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

یا پھر یہ تلقین کہ اپنی اپنی راہ نکال کر اپنی منزل کو تھام لے

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں زیستن عذاب است
گراز دست تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

ہم کو یہاں یہ ماننا پڑے گا کہ اقبال کی فکر دراصل اس آفاقی پیغام کی بازگشت ہے جو صدیوں اور قرنوں سے دنیا کے عظیم مفکر، دانشور اور فلاسفر اپنے اپنے زمانوں میں لوح انسانیت پر نقش کر گئے ہیں۔ اور جو زمانے کے تغیر و تبدل کی گرد سے بھی بچ گئے ہیں۔ اور حوادثِ عصر اور امتداد زمانہ کے ہاتھوں ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ اقبال کا کلام سراسر عملی ہے اور اس میں pragmatism اور opti-mism کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ قرآن حکیم کی تصریح ہے کہ ناامیدی

کفر ہے

لا تقنطوا من رحمة الله

اقبال کا درس بیداری قوم و ملت کے مدعا سے موسوم ہے۔ وہ جہاں بھی انقلابی انداز سے خفتہ اور بے ضمیر قوموں کو بیدار کرنا چاہتا ہے وہاں بیم و رجا کے خط امتیاز کو بہت ہی خوش اسلوبی سے دکھا کر شاہین کی پرواز سے بیداری کو منطبق کرتا ہے انہوں نے "شکوہ" میں ایک دلیرانہ اور بے باکانہ انداز میں اللہ تعالیٰ سے شکایت کا دفتر کھولدیا۔ گویا یہ تصویر رکھادیتا ہے کہ مسلمان قوم اب قعر مذلت سے اٹھ کر ناامیدی اور یاس کے ہاتھوں کبھی افتخار سے سر نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن "جوابِ شکوہ میں اس ناامیدی کے مرض کا مداوا تجویز کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دو دوست آپس میں اپنی پرانی کدورتیں بھول کر نزدیک آگئے ہیں۔

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوع انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں
امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہ گار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں

ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

(شکوہ)

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوع انسان کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا کس نے
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

(جوابِ شکوہ)

اقبال انسانی وجود کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بھی سب سے پیش پیش ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان صحیح معنوں میں مخلوقات خدائی میں فضیلت و سرفرازی کا ثبوت دے اور اس کیلئے اسے اپنی ماہیت اور جوہر کی نمایش کرنا اس کارخانۂ ہستی میں ضروری ہے۔ اس وجہ سے پوشیدہ آرزوں کو جستجو کے میدان میں برسرپیکار ہونے کا موقع دے۔

زندگانی رابقا از مدعا است
کاروانش رادرا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو رادر دل خود زندہ دار
تانگر در مشت خاک تو مزار
آرزو جان جہان رنگ بو است
فطرت ہر شی امین آرزو است
از تمنا رقص دل در سینہ ہا
سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
طاقت پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسی ادراک را
دل ز سوز آرزو گیرد حیات
غیر حق میرد چو او گیرد حیات

اقبال اس وجود کے حسن سے لطف اندوز ہونے کیلئے کائنات کے ہر ذرے پر اپنی کمند ڈالنے پر بھی خاموش نہیں بیٹھتے بلکہ سمندر کی موجوں کی طرح کنارے پر پڑی کنکریوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے اور اپنی روح کو گرماتا رہتا ہے۔

ساقیا برخیز و مے در جام کن
محو از دل کاوش لیام کن
می کن اندیشہ راہشیار تر
دیدہ کن بیدار را بیدار تر
اعتبار کوہ بخشد کاہ را
قوت شیراں دہد روباہ را
خاک را اوج ثریامی دہد
قطرہ را پنہای دریا می دہد
خامشی را شورش محشر کند
پای کبک از خون باز احمر کند

اقبال شاعر ملت بھی تھے۔ اور شاعر آفاق بھی۔ ان کو مبلغ اسلام بھی کہا جاتا ہے اور مصلح قرن آخر سے بھی وہ ملقب ہوئے۔ ان کی فکر کی رنگارنگی اور تہہ داری سے علم و دانش کے جہاں سوتے پھوٹتے ہیں وہاں عملی تحریک کیلئے نئی نئی راہوں کی کھوج اور سراغ کا احساس ملتا ہے۔ ان کی فکر سے بیسویں صدی میں بین الاقوامی سطح پر انسان دوستی اور ہیومن ازم (Humanism) کی تحریک کو تقویت ملی اور قرآن کی اصطلاح میں امت واحدہ کے تصور کو ایک صحیح سمت ملی۔ انسان دوستی کا تصور ان

کی شاعری کا منہاج ہے۔ ان کی نظر میں تمام دنیا کو ایک ہی ریاست یا مملکت میں تبدیل کرتا توحید کے تصور میں مضمر ہے۔ اور اسلام توحید کے اصول کو عملانے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک وسیلہ ہے۔ انہوں نے "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں صاف صاف کہدیا تھا کہ "میری مثنوی کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ میں دراصل ایک بہترین انسانی سماج کی تلاش میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ لیکن اس تلاش میں ایک ایسے سماجی نظام کو کیسے نظر انداز کروں جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ نسل، ذات پات، رنگ کے فرق کو یک قلم مٹادے۔"

جس وقت توحید کا عقیدہ راسخ ہو جائے تو ہم کو رسالت یا نبوت کی افادیت خود بخود معلوم ہو جاتی ہے۔ رسالت ہی امت کی شیرازہ بندی اور ایک صحیح نظام کے نفاذ کی ضامن بن جاتی ہے۔ یہی زندگی کے میدان میں آدم کی جدوجہد کیلئے رہنما اصول متعین کرتی ہے۔

از رسالت درجہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صدہزار مایک است
جزوِ ما از جزوِ مالاینفک است
دامنش از دست دادن مردن است
چوں گل از باد خزاں افسردن است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

فرد از حق ملت ازوئے زندہ است
از شعاع مہر اُو تابند است

اس مجددانہ تصور کے ساتھ ساتھ انہوں نے مغرب کے باطل سیاسی نظام کی کھل کر مخالفت کی ہے۔ ان ازموں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے، جنہوں نے وقتاً فوقتاً انسان کو غلام بنالیا۔ اور مرعوب کرنے کیلئے اختراع کئے ہیں۔ میکاولی کے تصور وطن کو مسمار کر کے انسان کو اس کے مضر نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔

آن فلارنساوی باطل پرست
سرمہ او دیدۂ مردم شکست
نسخہ بہر شہنشاہان نوشت
در گل مادانۂ پیکار کشت
بتگری مانند آزر پیشہ اش
بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت
فکر او مذموم را محمود ساخت

جہاں میکاولی کے صحیفہ سیاست موسوم The Prince کو تار تار کر کے چھوڑ دیا وہاں فاشزم اور نازی ازم کے مسموم ہوائی جھونکوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انسان را قبائل ساختند

یہ ہے اقبال کا تصور انسانیت جو آدمیت کی معراج ہے۔ جو انسان کو زندگی گزارنے کا گر سکھاتا ہے۔ یہ تصور زمان کی بندشوں سے آزاد ہے۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو ہمارے لئے انقلاب آفرینی کی دعوت رکھتی ہے۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمان موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خوردو نوش
خودی کی یہ ہے منزل اولین
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسم زمان ومکان توڑکر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر ایک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پر ہو آشکار

تو ہے فاتح عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سر نوشت
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس
اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلّی بسوزد پرم

آج جب ہم بیسویں صدی کو الوداعی سلام کرتے ہیں اور نئی صدی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں یہ سوال الجھ کر رہ جاتا ہے کہ نئی صدی کے تقاضے کیا ہونگے۔ مسائل کیا ہونگے۔ زندگی کے طور و طریقے کیا ہونگے۔ غور و فکر کے کیا تقاضے ہونگے۔ عالمی برادری کی تاریخ میں کون سا نیا باب تحریر ہوگا۔ حالانکہ اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ نئی صدی پرانی صدی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ یہ صدی پرانی صدی کی کوکھ سے جنم لیگی اور وہ تمام خصائص اور ماضی کی میراث سے ہی متصف ہونگی۔ اکیسویں صدی سائنس اور تیکنالوجی کا اوج کمال ہوگی اور اس میں کمپیوٹر کا استعمال زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہوگا۔ نئی صدی کی خصوصیات میں وسعت نظری، برق رفتاری، اور آفاقی قدروں کی طرف رجحان عام ہوگا جبکہ تنگ نظری، استحصال، تعصب اور خود ساختہ بندشوں کے خلاف ایک مسلسل جنگ کا آغاز ہوگا۔ اگرچہ ان باتوں کیلئے انسان گذشتہ چند دہائیوں سے ہی برسر پیکار رہا ہے۔ شاعر مشرق نے پہلے ہی انسان کو اس تاریکی سے آگاہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اپنے پراگندہ شعور سے مایوس نہ ہو اور اس حالت سے ناامید نہ ہو جو حالت بقول

ایلیٹ(T.S. Eloit) بنجر زمین یا (wasteland)سے مشابہ ہے۔

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ
غمین نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ

اقبال مغربی تہذیب سے بیزار اس وجہ سے تھے کہ اس وجہ سے اخلاقی اقدار کا زوال حدوں کو پار کر گیا ہے۔ اس میں قدروں کے شکست وریخت کا عمل اس حد تک تیزی سے جاری ہے کہ اس نے جہاں وطن پرستی کو مذہب کا لبادہ اوڑھ لیا وہاں انسانی عقل وشعور کو مادیت کے پھندے میں گرفتار کر لیا۔ اقبال اس طرز فکر پر خون کے آنسو رو رہے تھے۔ اسی وجہ سے اس نے انسانیت کے بچاو کیلئے اسلامی طرز فکر وعمل کو علاج کے طور پر تجویز کر لیا۔ اسلامی تاریخ اور روایات کا احیائے نو کیا تاکہ انسان اسلام کے تابندہ اور درخشندہ ستاروں اور سورماؤں سے متعارف ہو۔ اسی ضمن میں اقبال نے حریت کے درس کو سمجھانے کیلئے سر حادثہ کربلا کو آشکار کیا۔

موسیٰ و فرعون وشبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آن سر جلوۂ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمیں کربلا باریدہ و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد
ماسوااللہ را مسلمان بندۂ نیست
پیش فرعونی سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد
تیغ لا چوں از میاں بیرون کشید
ازرگ ارباب باطل خون کشید
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

اقبال آزادی فکر کے قائل تھے لیکن وہ آزادی نہیں جو انسان کو آوارہ گردی اور

شکم سیری کی موجب بنے بلکہ انسانی وقار کو قایم رکھے۔ انسانی جوہر کو سماج میں پھلنے پھولنے کے مواقع عطا کرے۔ اقبال کی شاعری میں جا بجا ایسی تصریحات ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر محشر برپا کر کے انسان کو محاسبہ نفس کرنے پر مجبور کرے۔ اسی وجہ سے ان کی آواز بلالحاظ مذہب وملت یا بلالحاظ رنگ و نسل ہر ایک کو متاثر کرتی ہے۔ "زبور عجم" میں نظم "از خواب گراں خیز" میں یہی تار چھیڑ کر مضراب کا ایک سماں کھینچتا ہے۔

ای غنچہ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانہ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالہ مرغ چمن از بانگ اذاں خیز
از گرمی ہنگامہ آتش نفساں خیز
از خواب گران خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

خورشید کہ پیرا یہ بسیماب سحر بست
آویزہ بگوش سحراد خون جگر بست
از دشت و جبل قافلہ ہا رخت سفر بست
ای چشم جہاں بین بہ تماشاہی جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

اس نظم میں "خواب گراں" کی تکرار ہمارے تحت الشعور میں اتر کر ہم کو

دنیائے ہست و بود میں غور و فکر کرنے پر اکساتی ہے اور ہم اس فطرت شناس شاعر کی لے سے مسحور ہو کر تسخیر فطرت کے جذبے سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ پیامِ مشرق میں بھی "فصل بہار" نظم میں شاعر قاری کی روح کو بے قرار کر کے اسے مناظر فطرت میں کھو جانے کی ترغیب دیتا ہے۔

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار
مست ترنم ہزار طوطی و دراج و سار
بر طرف جویبار کشت گل و لالہ زار چشم تماشا بہار
خیز کہ درکوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار
خیز کہ در باغ باغ، قافلۂ گل رسید
باد بہاراں وزید مرغ نوا آفرید
لالہ گریبان درید حسن گل تازہ چید عشق غم نو خرید
خیز کہ در باغ وراغ قافلۂ گل رسید

اقبال کا تصور حرکت انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی علامت ہے۔ وہ زمانے کی برق رفتاری سے عبارت ہے کیونکہ اس کائنات کی ہر شئے متحرک ہے۔ حرکت ہی زندگی ہے۔ اور جمود کو موت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کا وژن (vision) بہت آگے تھا۔ وہ فن کو بھی اسی مقصد کیلئے استعمال کرتا تھا کہ وہ ہر شئے کو ذوق نمود عطا کر کے اس کو حرکت میں لائے۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصود ہنر سوز حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیسان وہ صدف کیا وہ گہر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال کا کہنا ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہی اشیاء کے پوشیدہ امکانات کا ظہور ہوتا ہے۔ایک جگہ اس کی وضاحت کرتے کرتے لکھتے ہیں۔

لا لتسبو الدھران الدھر ھو اللہ

" Time is a great blessing while it kills and destroys it also expands and brings out the hidden possbilities of things. The possibility of change is the greatest asset of man in present surroundings.}

ان کی نظم "ساقی نامہ" کے یہ منتخب اشعار اس تصور کی وضاحت لرتے ہیں۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار
زمانے کے انداز بدلے گئے

نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شئے سے پیدا رم زندگی
اسی سی ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
زمانہ کہ زنجیر لیام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

اقبال نے طالب علم کی شخصیت ابھارنے کیلئے یہ شرط رکھدی ہے کہ اسے کسی طوفان سے واسطہ پڑے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

فرد کی انفرادیت individuality میں ایک انقلاب برپا کرنے کیلئے اقبال کا تصور خودی شرط اولین ہے۔ خودی کا تصور ان کے یہاں ایک متصوفانہ پس منظر میں پیش ہوا ہے اور خودی وہ چنگاری ہے جو انسانی وجود میں حرارت بھڑکاتی ہے ۔یہی وہ تلوار کی دھار ہے جو انسانی وجود کی اہلیت کیلئے ایک کسوٹی کا کام دیتی ہے

خودی کا سر نہاں لا الہ الااللہ
خودی ہے تیغ و فساں لا الہ الااللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الااللہ

خودی شاہین کی پرواز ہے۔ خودی مسافر کی رفتار کا انداز ہے۔ خودی مومن کی پہچان ہے۔ خودی مسلمان کی آن بان ہے۔ خودی مجاہد کی اذان ہے خودی قلندر کا آستان ہے۔ خودی میں زندگی کا راز مضمر ہے۔ خودی میں عشق کی کلید ہے۔

بے ذوق نمو زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی

چوں حیات عالم از زور خودی است
پس بقدر استواری زندگی است
قطرہ چو ں حرف خودی از بر کند
ہستی بے مایہ را گو ہر کند
سبزہ چوں تاب دمید از خویش یافت

ہمت او سینہ گلشن شگافت
چوں زمیں بر ہستی خود محکم است
ماہ پابند طواف پیہم است
زندگانی ہے صدف قطرہ ٔپنہاں ہے خودی
وہ صدف کیا جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

یہی خودی قوموں کے ارتقاء کی علامت ہے۔ یہ جذبہ کمال پر دلالت کرتی ہے۔ جب خودی کا جذبہ قوموں میں پیدا ہو تو وہ امت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ جو قوم اپنی حالت تبدیل کرنے کیلئے کوشش نہ کرے اللہ بھی اس کی حالت تبدیل نہیں کرتا۔ قرآن کریم کی یہ آیات اس پر دال ہیں

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیرو ما با انفسھم

(بے شک اللہ اس قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں لاتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت بدلنے پر کوشش نہ کرے)

والذین جاھدو افینا لنھدِ ینھم سبلنا

(اور جو لوگ ہمارے لئے جہاد (کوشش) کرتے ہیں تو ہم ان کو ضرور اپنی راہوں سے روشناس کریں گے)

اقبال کی نظر میں قوموں کے عروج وزوال کی داستان معرکۂ حق وباطل سے عبارت ہے۔ جو بھی قوم حق کیلئے سر بکف نکل پڑے وہ کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوتی ہے اور جو باطل پرست نظریات کو دل میں لئے ہوئے اس کی ترویج کیلئے کوشان رہے گی وہ زندگی کے میدان میں تھک ہار کر پیچھے رہے گی۔ اس وجہ سے اقبال

قوموں کی حیات کیلئے نسخہ کیمیا پیش کرتا ہے۔ وہ قوموں کی امامت کا معاملہ بھی حل کرتا ہے اور صحیح امامت کا تصور پیش کر کے قوموں کو باطل نظریات کا شکار بن جانے سے متنبہ کرتا ہے۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے مری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

اسی جگہ مغربیت و مشرقیت کے خدوخال الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ٹیگور کے الفاظ میں "انسانیت کی آواز مغربی ممالک میں ناپید ہے اور مشرقی ممالک خصوصاً ایشائی ممالک میں انسانیت کی پوجا ہو رہی ہے۔" اسی طرح اقبال کی نظر میں بھی مغربی تہذیب اپنی شکست کی آواز ہے۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیا نہ بنے گا نا پائیدا ر ہوگا

ان کی نظم "شعاعِ امید" کا مقصدی محور بھی یہی ہے کہ ہندوستان میں امید کی کرن نظر آتی ہے جبکہ مغرب میں یاس و حرمان کا منظر ہے

اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیاہ پوش
مشرق نہیں گو لذت نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالم لاہوت ہے خاموش

دراصل اقبال مغرب سے اس وجہ سے بیزار تھے کہ وہاں ایک طرف مادہ پرستی غالب ہے اور دوسری طرف مشینوں کا دور دورہ ہے۔ مغرب مشین زدہ ہے۔ مغرب کا انسان مشینی نظام میں اس طرح غرق ہے کہ اس کی انفرادیت ختم ہو چکی ہے۔ وہ مشینوں کے فروغ میں اس قدر دلچسپی لے رہا ہے گویا یہی اس کا مدعا و مقصد ہے زندگی کا۔ مغرب نے اگرچہ سائنس اور تیکنالوجی میں پیش رفت کی ہے اور انسان کی بہبود کیلئے بہت کچھ کیا ہے لیکن وہ تصوف کی چاشنی سے ناواقف ہے۔ سحر خیزی کے ترنم سے بے خبر ہے۔ انسانی سوز و ساز سے نابلد ہے۔

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

مغرب دل کو گوشت کا لوتھڑا سمجھ کر اس کی functions علم الابدان کے اصولوں کے تحت واضح کرتے ہیں لیکن وہ اس آرگن organ کے حقیقی راز

سے بالکل نا آشنا ہیں۔ مغرب کی تہذیب کا یہ المیہ صرف اقبال نے ہی واضح نہیں کیا ہے بلکہ مغرب کے عظیم مفکرین نے بھی اپنے اپنے انداز میں اسے دہر لیا ہے اور اس تہذیب کی تلخ الفاظ میں نکتہ چینی کی ہے۔ اگر ہم نئی صدی کے منفی پہلوؤں پر نظر کریں تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مادیت کا نظریہ جس کی ترویج و تبلیغ میں دنیا کے عظیم سیاست داں مشغول ہیں۔ یہ نظریہ جدید انسان کا ذہن مفلوج کر چکا ہے۔ اس کی چکاچوند روشنی سے آج کے انسان کی بصارت کھو چکی ہے۔ آج دنیا پر تباہی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اور ایک مفکر کی نظر میں "خودکشی آج ایک بڑی قدر بن گئی ہے" اس ماحول میں شاعر ملت علامہ اقبال کا نور بصیرت عام کرنا بہت ضرورت ہے۔

خدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نور بصیرت عام کردے

اس فضا میں جو باطل نظریات سے مسموم ہو چکی ہے۔ اقبال کا پیغام ایک فرحت انگیز اور روح پرور آواز ہے۔ یہ وہ باد صبا ہے جو گلشن میں پژمردہ پھولوں میں زندگی کا رنگ بھر سکتی ہے۔ یہ وہ روشنی کی کرن ہے جو یاس و ناامیدی کے ظلمتوں کو چیر کر ایک تابناک مستقبل کا خواب دکھا سکتی ہے۔ یہ وہ حرکت ہے جو جمود کے یخ بستہ تودوں کو پگھلا کر ان میں جدوجہد کے سامان پیدا کرتا ہے۔ اقبال کا کلام ہر رنگ سے اور ہر طرح سے ان تمام امراض کا مداوا ہے جو امراض جدید دور میں انسان کے پراگندہ مزاج سے پیدا ہوئے ہیں۔ اقبال اسی وجہ سے پختہ شعور پیدا کرنے کیلئے قوموں میں ایک نئی جان پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں وہ مشرقی قوموں کو راہِ نجات دکھلانے کی پیہم کوشش کرتے

ہیں۔اس مثنوی میں شاعر کے تموج خیز ضمیر اور فکری بلند پروازی کی پرچھائیاں اول سے آخر تک ملتی ہیں۔وہ انسان کو اس کی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔اور انفرادی استقلال کے ساتھ ساتھ اجتماعی استقلال کا بھی درس دیتے ہیں۔اس مثنوی کی تمہید میں ہی پیر رومی کا ذکر چھیڑ کر اسے مشرقی اقوام کیلئے ایک نمونہ راہبر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر
کارواں عشق و مستی را امیر

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شاعر یا مفکر کی نظریں عصری آگہی کی سرحدیں پار کر کے مستقبل کے واقعات وحادثات کو بھانپ لیتی ہیں۔اسی وجہ سے وہ ماضی وحال کے آئینے میں مستقبل میں آنے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اگر ہم تاریخ عالم کی ورق گردانی کریں تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ شاعروں اور مفکروں نے تاریخ کے نازک موڑوں پر انسانی برادری کی وہ خدمت اور رہنمائی کی ہے جو تاریخ میں سنہری الفاظ میں تحریر کی گئی ہے۔یا انہوں نے آنے والی نسلوں کے ناپ وہ نوشتے تحریر کئے جو سدا بہار پھولوں کی طرح انسانی دل ودماغ کو معطر کرتے رہے۔انہی شخصیات میں ہومر،ڈانٹے،سقراط،ٹیگور،شیکسپیر،حافظ، گوئٹے،کالیداس،غالب وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔علامہ اقبال کو بھی اس نسبت سے عظیم مفکروں کی صف میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کی فکر میں جو گہرائی اور وسعت پائی جاتی ہے وہ آفاقیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔اقبال کی عظمت کا راز اس بات میں بھی پوشیدہ ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ نظریات کو اس انداز سے پیش کیا

کہ عام قاری بھی مختلف فلسفی مکاتب کا نقاد بن کر رہ گیا۔ اقبال نے مسائل کو اس انداز سے پیش کیا ہے اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ طریقہ کا ہی فلسفیانہ ہے۔ لیکن ان کا انداز نرالا ہے انوکھا ہے اور کسی بھی جگہ ثقیل یا بوجھل محسوس نہیں ہوتا۔ مختلف سیاسی نظاموں میں خوبیوں اور خرابیوں کا تجزیہ اس طرح کیا ہے گویا جراحی کر رہا ہے۔ اس ضمن میں جمہوری نظام، سیکولرازم، سوشلزم، کمیونزم وغیرہ کا خاکہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ ان کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کے خلاف "مزدور" کی حوصلہ افزائی کر کے اسے انقلاب لانے پر تیار کرتے ہیں۔

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفای دہ خدایاں کشت دھقانان خراب
انقلاب
انقلاب ای انقلاب
شیخ شہر از رشتہ تسبیح صد مومن بدام
کافراں سادہ دل را برہمن زنار تاب
انقلاب
انقلاب ای انقلاب

یا یہ انداز

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو

کاخِ امرا کے در و دیوار ہلادو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑادو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

جمہوری نظام کی کوتاہیوں کو بے نقاب کر کے اس نظام کے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یہاں یہ نکتہ پر لطف ہے کہ اقبال کی نظر میں باطل نظریات کی ترویج کیلئے ہی دنیا میں بہت سے مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں اور ان کی پیشوائی ابلیس کر رہے ہیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں بحث و تمحیص اور غور و فکر کرنے کے بعد جدید دنیا میں چل رہی تحریکوں کا تجزیہ کر کے ابلیس اپنے مریدوں کے نام حکم نامہ جاری کر رہا ہے۔

ہے مرے دست تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و ماہ کیا آسمان تو بہ تو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق

میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
فرد کی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشان روزگار آشفتہ مغز آشفتہ ہو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

جہاں رنگ و بو کی تصویر پیش کر کے ابلیس صرف اس قوم سے خوفزدہ ہے جس کی خاکستر میں شرار آرزو ہے۔ جو سحر گاہی کے آنسوؤں سے وضو کیا کرتی ہے۔ وہ اس نظام سے برہم ہے۔ جو یہ سکھاتا ہے کہ یہ زمین بادشاہوں کی نہیں بلکہ اللہ کی ہے۔ جو نظامِ دولت کو ہر آلودگی سے پاک کرتا ہے اور دولت مندوں کو دولت کا امین بناتا ہے۔ وہ اس آفاقی آئین سے ڈر رہا ہے۔ جو مرد آزما ہے مرد آفرین ہے ناموس زن کا حافظ ہے۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں ہم کو ان تمام فتنوں کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے جو اس کرۂ ارض پر فساد پھلانے کے موجب ہیں۔ ابلیس اس بات کے درپے ہے کہ کس طرح شر کا بول بالا ہو اور اس کیلئے وہ انسان کو طرح طرح کے رنگین خواب دکھلا کر اس کو خدائی پیغام سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے مشیر طرح طرح کے حربوں سے انسان کے ذہن کو تعصب کی لعنت میں گرفتار کر کے اسے زندگی کے اصلی مفہوم سے ناآشنا رکھتے ہیں۔ جس طرح ڈاکٹر فاسٹس Dr. Fastus اس حالت زار میں گرفتار ہو کر آخری لمحوں میں توبہ کرنے کی لاکھ جتن کر کے بھی کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ وہ چند شادی و راحت کی گھڑیوں کیلئے اپنی آزادی کو شیطان کے ہاتھوں فروخت کرتا ہے۔ اسی طرح آج کے انسان کو بھی ابلیس کے عمال اس کمند میں گرفتار کرنیکی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ اس دائمی سکون اور اطمینان سے لطف اندوز نہ ہو سکے جس کا وعدہ بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنے خالص بندوں سے کیا ہے۔

اگر ہم اس نکتے کو غور سے دیکھیں تو یہ بات بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ اقبال نے جہاں ملٹن کی طرح ابلیس کے انکارِ سجدہ آدم کو کافی حد تک سراہا ہے اور اسے اس جہاں میں سوز و ساز کا سرچشمہ مانتے ہیں لیکن وہاں ابلیس کی چالوں کا پردہ بھی چاک کر کے انسان کو اس کے دامن سے چھڑانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

اے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا

یا جبرئیل کو ابلیس کا جواب

آہ اے جبرئیل تو واقف نہیں اس راز سے

کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو
ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوق و نمود
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تاروپو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفان کے طمانچے کھارہا ہے میں کہ تو

اقبال کی فکر میں تنوع ہے۔ رنگارنگی ہے۔ بوقلمونی ہے۔ انہوں نے قرنوں کی جہالت کو اپنی روشن خیالی اور بصیرت سے یک قلم مٹادیا اور آنیوالی نسلوں کیلئے دانش مندی کے دریچے کھول کر رکھ دئے۔ ان کے خطبات میں بھی ایک بین الملی معاشرہ وجود میں لانے کیلئے چند کلیات کو واضح کیا گیا ہے۔ ان میں اجتہاد کے ادارے کو مستحکم بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اجتہاد کو ہی قوموں کے ارتقاء میں کلید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس ادارے کو جس قدر اہمیت دی جائے اسی قدر ایک آفاقی نظریہ **global view** فضائے سیاست پر چھاکر اس میں معنویت پیدا ہو سکتی ہے۔ اقبال جہاں روایت پرست تھے۔ وہاں روایت شکن بھی تھے۔ وہ ہر میدان میں ایک نئی روح ڈالنے کے متمنی تھے۔ انہوں نے جہاں قدیم روایات کا احیائے نو کر کے ان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا وہاں نئے نئے فکری معرکوں سے انسانی زندگی کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ ان کے فکر کی برق رفتاری اور سریع العملی نئے زمانے کے پیدا کردہ حالات کی غماز ہے۔ اور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس دعوائے

اشرفیت کا اہل ثابت کردے جو اس کو باقی مخلوقات سے افضل و ممتاز کرتا ہے۔

قوت ایمان حیات افزایدت
ورد لا خوف علیہم بایدت
چوں کلیمی سوی فرعونی رود
قلب او از لا تخف محکم شود
بیم غیراللہ عمل را دشمن است
کارواں زندگی را رہزن است
عزم محکم ممکنات اندیش ازو
ہمت عالی تامل کیش ازو

اقبال نے اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو کیلئے جو شرائط پیش کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے نئے دور کے تقاضوں اور challenges سے ہمکنار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں یکسانیت اور ہم آہنگی لانے کیلئے بے چین ہیں۔ دراصل اقبال انسانیت کے نام پر وہ درس دینا چاہتے ہیں تاکہ ایک آفاقی نظریہ کی تاسیس ہو۔ جگہ جگہ اس آفاقی نظریہ کے حامل انسان کے دل و دماغ کی تصویر کشی کی ہے۔ جو نئے معاشرے کی زینت ہو۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس مرد کامل کا تصور اقبال کی فکر اور فن پر محیط ہے۔ اسی لئے اقبال نے انسان کی تعلیم و تربیت کو چند مستحکم اصولوں کے تحت انجام لانے کی ترغیب دی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت میں جن باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں خودی، عشق، تجسس و جستجو، جذبہ ایثار، خدمت خلق اللہ، حریت فکر، عالی ہمتی، حوصلہ و استقلال، عزم و ثبات پر کافی زور دیا گیا ہے۔ اقبال دل و دماغ کے معرکہ میں دل کا ساتھ دیتے ہیں۔ عشق و عقل میں عشق کے دامن کو تھامتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عقل و دماغ کو بھی بے قابو نہیں ہونے دیتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشا لبِ بام ابھی

عقل ہم عشق است و از ذوق نگاہ بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جرأت رندانہ نیست
گرچہ می دانم کہ منزل ایجاد من است
در سفر از یا نشستن ہمت مردانہ نیست

اقبال نے تصریحی طور پر عشق کی فضیلت ثابت کی ہے۔ وہ عشق کو ہی انسانیت کی بقاء کا ضامن ٹھہراتا ہے۔ کیونکہ عشق زندہ دلی ہے اور زندگی زندہ دلی سے عبارت ہے۔ عشق آدمیت کی معراج ہے اور عشق مرد مومن کی زندگی کا ماحصل۔

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرماندہ عالم شود

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ماممکن است
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق راعزم و یقین لاینفک است
آن کنند تعمیر تا ویراں کند
ایں کند ویراں تا آباداں کند
عقل گوید شادشو آباد شو
عشق گوید بندہ شو آزاد شو

اقبال کا تصور کائنات بھی انوکھا ہے اور اس کو ایک اچھوتے پن سے پیش کر دیا ہے۔ وہ نٹشے کے اس تصور کو رد کرتے ہیں کہ یہ کائنات دائمی تکرار کے اصول پر رواں دواں ہے اور اس میں تبدیلی کا وقوع پذیر ہونا محال ہے۔ کیونکہ تخلیق کا عمل ختم ہو چکا ہے۔ اقبال کا یہاں وہی قرآنی تصور نئے فکری سانچے میں ڈھل چکا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شائد
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

کائنات کے بارے میں یہ تصور cosmology کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے بہت سے الجھے ہوئے مسائل حل ہو گئے ہیں اور بہت سے پراسرار معمے سلجھ گئے ہیں۔ یہ کائنات ارتقاء کے منازل میں گامزن ہے اور ہر آن ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ شکست وریخت کا عمل جاری و ساری ہے اور خالق کائنات اس کی نوک پلک سنوارنے میں مشغول ہے۔ خدا اور انسان کے مابین محاورہ

اس نکتہ کو واضح کر رہا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس کائنات میں حیات انسان بھی اس تخلیقی عمل سے سرشار ہے۔ اسی لئے زندگی فانی ہو کر بھی لافانی ہے۔

زندگی ہم فانی و ہم باقی است
ایں ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندہ مشتاق شو خلاق شو
ہم چوما گیرندۂ آفاق شو
بندۂ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہاں دیگراں
ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیش ماجز کافرو زندیق نیست
از جمال ما نصیب خود نبرد
از نخیل زندگانی بر نخورد

مرد حق بربندہ چوں شمشیر باش
خود جہانِ خویش را تقدیر باش

اقبال نے جو علامتیں اپنی شاعری میں استعمال کی ہیں وہ بھی نئے دور کے انسان کو اپنی ہستی کو سمجھنے کیلئے بہت کار آمد ثابت ہوئی ہیں۔ علامتوں کا یہ تخلیقی اظہار جہاں شاعری کی جان ہے وہاں معنویت سے پُر ہے۔ ان علامات کا شعری پیکروں میں ڈھالنا تخلیقی حسن کو بڑھاتا ہے۔ اور فن کو پختگی عطا کرتا ہے۔ جس طرح عظیم شعراء کے یہاں خاص خاص علامتیں استعمال ہوئی ہیں۔ جو ان کے شعور کے تہہ خانوں سے نکل کر فنی تجربوں سے مالامال ہو کر آفاقی معنویت سے مختص ہو گئی ہیں۔ اسی طرح اقبال کے یہاں علامتوں کا اظہار ایک خاص تہذیبی پس منظر کا آئینہ دار ہے۔ یہ علامتیں بھی سرحدوں کی بندشیں پار کر کے آفاقی رنگ لئے ہوئی ہیں۔ چاند سے خطاب۔

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
قصد کس محفل کا ہے آیا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شائد ہوا رنج رہِ منزل سے تو
آفرینش میں سرپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں
آہ! میں جلتا ہوں سوز اشتیاق دید سے
تو سرپا سوز داغ منت خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تیری رفتار ہے
میری گردش بھی مثال گردش پرکار ہے۔

"شاہین" نظم میں شاہین کی صفت کا پر لطف بیان کیا ہے۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیابان کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ باد بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیمارئ نغمہ عاشقانہ
خیابان سے ہے مجھ کو پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

اسی طرح گل لالہ، شمع و پروانہ۔ ہلال عید، فصل بہار، شبنم، جوئے آب و غیرہ علامتیں جدید دور کے مسائل کا حل پیش کرتی ہیں۔

اقبال نے نئی صدی کے امکانی امراض کی تشخیص کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے۔ انہوں نے مسائل کو حقیقت پسندانہ تناظر میں دیکھ کر ان کیلئے حل تلاش کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے شعراء نے شاہکار نظمیں لکھ کر اپنی قوموں کی تاریخ کو زندہ جاوید کردیا ہے۔ اور اپنی قدیم روایات کا احیائے نو کیا ہے۔ اس ضمن میں یونان کا ہومر، فارسی کا فردوسی، انگریزی کا ملٹن اور اٹلی کا ڈانٹے خاص خاص نام ہیں۔ اقبال بھی پیچھے نہیں رہے ہیں۔ ان کی معرکتہ الآرا مثنویاں

پڑھکر ہم کو عالمی سطح کے ان مشاہیر کی یاد آتی ہے۔ اقبال کا جاوید نامہ ڈانٹے کی "الٰہی طربیہ" Devine comedy کی بازگشت ہے۔ اقبال نے اس شاہکار میں قوموں کے عروج کیلئے علاج تجویز کیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک روحانی سفر کی روداد اور داستان ہے۔ جس سفر کو طے کرتے کرتے انسان سوز و سرور سے لطف اندوز ہو کر ایک دائمی مسرت حاصل کرتا ہے۔

آدمی اندر جہاں ہفت رنگ
ہر زماں گرم فغان مانند چنگ
آرزوئے ہم نفس می سوزدش
نالہ ہائے دل نواز آویزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است
می تواں گفتن کہ دارای دل است
بحر و دشت و کوہ کہ خاموش و کر
آسماں و مہر و ماہ خاموش و کر
گرچہ بر گردوں ہجوم اختر است
ہریکی از دیگری تنہا تراست
ہریکی مانند ما بیچارہ ایست
درفضائی نیلگوں آوارہ ایست
ایں جہاں صیداست صیادیم ما
یا اسیر رفتہ از یادیم ما

"جاوید نامہ" حقیقت میں انسانی زندگی کو جاودانہ صورت عطا کر کے اس میں بامقصدیت پیدا کرتا ہے۔ یہ زماں و مکاں کی سرحدوں کو روندھتا جا رہا ہے۔ ہم کو لگتا ہے کہ ہم ایک ایسی مثالی دنیا میں قدم بوس ہوئے ہیں۔ جو جلوہ افروز ہو کر ہماری بصارت کے دریچے کھول دیتا ہے۔

زندگی از لذت غیب و حضور
بست نقش ایں جہاں نزد و دور
اس چناں تار نفس از ہم گسیخت
رنگ حیرت خانۂ ایام ریخت
ہر کجا از ذوق و شوق خود گری
نعرۂ من دیگرم تو دیگری
ماہ و اخترا خرام آمو ختند
صد چراغ اندر فضا افروختند
بر سپہر نیلگوں زد آفتاب
خیمہ ی زر بفت با سیمیں طناب

اس کائناتی نظام کے ذرّے ذرّے کو تاباں کر کے اقبال ایک ایسے منظر کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو انسان کو اس کے اصلی مقام سے باخبر کرتا ہے جو اس کا اس کائنات میں ہے۔ یہ نظم انسانیت کی معراج ہے۔ اور اس میں وہ رموز و اسرار پوشیدہ ہیں جو روحانی سکون کے باعث بننے میں کار آمد اور کار گر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس نیلگوں کے نیچے زندگی بسر کرنے والا انسان اپنی فکر کی کمند آسمان پر ڈالنا

چاہتا ہے۔

آ

سانوں پر میرا فکر بلند!
میں زمین پر خوار و زار و دردمند
کار دنیا میں رہا جاتا ہوں میں
ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں

اقبال کی فکر زمین کی بلندیوں سے گزر کر آسمان کے ستاروں کو گرفتار کرنے کی جست لگاتی ہے۔ اسی لئے وہ انسان کو آزادی کا پیغام سنا کر اسے زندگی میں لذت جستجو کی ترغیب دیتا ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک کم جوئے آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

اس روحانی سفر کا آغاز آرزوئے جستجو اور جذبہ تجسس سے لبریز ہے۔ لیکن اس کا انجام وصل مدعا سے عبارت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاشق ہجر و فراق کی سختیوں سے نکل کر وصل کے جام پی پی کر عالم علوی میں پیش قدمی کر رہا ہے۔ اس سفر کی تمثیل پیش کر کے شاعر نے انسانی زندگی کے سفر کا ایک عجیب اور نرالا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس سفر میں دنیا کے مشہور مفکرین سے ملاقات اس بات کی غمازی کر رہی ہے۔ کہ شاعر کا ان سے روحانی رابطہ بندھا ہوا ہے۔

المختصر اقبال کی فکر ایک وسیع فضا پر محیط ہے اور یہ فکر نئی صدی کے انسان کی قدم قدم پر رہنمائی کرے گی۔ کیونکہ یہ فکر رنگا رنگ پہلوؤں کی عکاس ہے۔ آج کی

دنیا میں جبکہ انسان باطل پرستی سے دب کر اپنی شناخت کھو رہا ہے۔ اور وہ زندگی کے پیچیدہ مسائل سے تنگ آکر خودکشی کے سائے میں ابدی نیند سونے کی سوچ رہا ہے۔ اقبال کا کلام ایک مرہم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے اس کے فیضانِ فکر کو عام کرنے کی کوشش کی جائے اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اس پیغام کو عام کرنے کیلئے بروئے کار لائے جائیں۔

اقبال نئی صدی کے افق پر ایک درخشندہ ستارے کے طور پر چمک جائیں گے۔ اور اس کی ضیا سے انسان کا ذہن تر و تازہ اور شاداب رہے گا اور انسانیت کی کھیتی ہری رہے گی۔ اس کیلئے ہم کو مشرقی طرزِ فکر اپنانے کی کوشش کرنی ہو گی۔ اور اسلام کا وہ آفاقی پیغام اپنی عملی زندگی کیلئے سامنے رکھنا ہو گا۔ اور اسلامی نقطہ نگاہ ہی آج کے دور پر آشوب کیلئے حل ہو گا۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبال کو صحیح معنوں میں جدید دور کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔ اس کی فکر کے گوشے لاتعداد ہیں۔ اور ان گوشوں کو واضح طریقے سے پیش کرنا ایک ناممکن بات ہے۔ اقبال کی فکر کی معنویت کو آفاقی رنگ سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس میں ہم نئی صدی میں بہتر ڈھنگ سے زندگی بسر کرنے کے طور و طریقے سیکھ سکتے ہیں۔ اور نیابتِ الٰہی کا خواب شرمندہ تعبیر کر سکتے ہیں۔

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی معنویت

حسن زینہ گیری

علامہ اقبال جسے بجا طور پر "شاعر مشرق"، شاعر اسلام" "حکیم الامت" جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے کے ساتھ اس سے بڑی ناانصافی کوئی اور نہ ہو گی کہ اس کو محض ایک فرقہ، ایک مسلک، ایک علاقہ یا ایک دور کا شاعر کہا جائے۔ دراصل ان کی شاعری، ان کا مسلک، ان کا طرزِ فکر اور ان کا فلسفہ زندگی سب آفاقی ہیں۔ اس لئے اس کو ایک ہی خول میں بند کرنا مناسب نہیں۔ خصوصاً جب اسلام وحدت انسان اور وحدت خدا کی بنیاد پر ایک عالمگیر انسانی برادری کا انقلابی تصور لیکر آیا ہے۔ اقبال یقینی طور پر قرآن اور سیرت محمدؐ سے تحریک (inspiration) حاصل کرتا ہے اور قران اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا پیغام فی الحقیقت آفاقی پیغام ہے۔ جو

بنی نوع انسان کو رنگ ، زبان، جغرافیہ، نسل، یا ذات یا برادری کی بنیاد پر امتیاز نہیں کرتا بلکہ جملہ انسانیت کو اولادِ آدم اور بندۂ خدا کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال اپنے ذہنی سفر کے آغاز میں وطنیت سے متاثر بھی ہوئے۔ اسی لئے اس دور میں ترانۂ ہندی، ہمالہ وغیرہ وطن پرستی کے جذبہ سے معمور نظمیں بھی ان کے قلم سے پھوٹ پڑیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۰۸ء کے وسط تک اقبال کا فکر ارتقاء اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ وہ اس مخالف اسلام نظرئے کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ اسی طرح شروع میں روس کے بالشویک انقلاب میں ترقی کی کرن نظر آئی مگر جلد ہی اس نظریہ کو بھی انہوں نے گمراہ کن قرار دیکر اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا، اقبال دین وسیاست کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح وہ تقلید جامد اور خانقاہی مزاج کے خلاف تھے۔ وہ مغرب کو جہاں فطرت کے سربستہ راز آشکار کرنے پر دادِ تحسین دیتے تھے اور مسلمانوں کو بھی اپنے شاندار ماضی کی روایات کی روشنی میں تسخیر کائنات پر ابھارتے تھے۔ وہاں مغربی مادہ پرستی پر انہوں نے کاری ضربیں بھی لگائیں۔ آج اکیسویں صدی میں فکر اقبال کی معنویت کو اسی تناظر میں بہتر طور سمجھا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اقبال چونکہ عالمگیر سچائیوں کا نقیب ہے اس لئے اس کی شاعری پر گردشِ لیل و نہار کا کوئی اثر نہیں۔ یہ زمان و مکان کے قیود سے ماورا ہے۔ یہی چیز اقبال جیسے دانائے راز کو حکیم الامت ہی نہیں حکیم العالم کے عظیم مرتبے پر پہنچاتی ہے۔

تعمیر نو کا تصور

ڈاکٹر اقبال نے جس دور میں امت مسلمہ کی بیداری کیلئے زبان اور قلم اور خداداد صلاحیتوں کا استعمال کیا اس وقت چالیس سے زائد ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ تعلیمی پسماندگی، معاشی بدحالی، سیاسی افراتفری ان کا مقدر بن چکی تھی۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بے خبری اور اسلامی عقائد سے ناواقفیت سے ان کا وجود اسلام کے انقلاب پرور روح سے خالی ہو چکا تھا۔ عصر حاضر کے تقاضوں سے اپنی زندگی کو ہم آہنگ کرنے میں وہ ناکام ہو چکے تھے۔ اقبال کی نگاہِ دور بین سے یہ حقیقت مخفی نہ تھی کہ سائینس کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے ایک نئی دنیا کا ظہور ہونے والا ہے اور اگر مسلمانوں نے بدلتے حالات کے مطابق اپنی قوم کی از سر نو تعمیر نہ کی تو وہ پیچھے رہ جائیں گے کیوں کہ زمانہ کسی قوم یا فرد کا انتظار نہیں کرتا۔ جو قومیں زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر خود کو نئے چیلنجوں کے مطابق ڈھال نہیں سکتیں وہ یا تو صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں یا ترقی یافتہ قوموں کی دست نگر بن جاتی ہیں۔ اس لئے علامہ مسلمانوں کو عالم نو کی تعمیر و تشکیل کی دعوت دیتا ہے۔

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرار زندگی نیست

وہ مسلمانوں کو تسخیر کائنات کیلئے ابھارتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں اپنا جہاں خود اپنے

ہاتھوں تعمیر کرنا ہے۔ تم دوسروں کے بنائے ہوئے جہاں میں اپنی مرضی کے خاکوں میں رنگ بھر نہیں سکتے۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

وہ تقلید (شخصیت پرستی) اور ظن (قیاس) کو قومی تعمیر و تشکیل کیلئے تباہ کن سمجھتا ہے۔ اور اس کے بجائے تحقیق اور یقین کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کرتا ہے۔

از مسلمان دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زماں جانم بلرزد در بدن

اس آفاقی شاعر نے انسانوں سے مخاطب ہو کر کہا

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اقبال کے نزدیک کسی قوم کے زندہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ وہ حرکی و حرارتی جذبات سے معمور ہو اور ہر دم انقلاب کا لاوا اس کے سینوں میں پگھلتا رہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

وہ بے انقلاب زندگی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں اور تعمیر نو کیلئے زمانے کے تقاضوں اور زندگی کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن جس سے اقبال اپنے شعری

تخیل کے چشمے کو سیراب کرتے ہیں، بھی قوموں کو آپ اپنے ہاتھوں تقدیر بدلنے کیلئے پکارتا ہے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیر و ما با انفسھم (اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کی حالت بدلتا نہیں جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہ بدل دے)

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

یاد رکھئے قرآن نے زندگی کا تصور پیش کیا ہے وہ سکوتی (static) نہیں بلکہ حرکی (dynamic) ہے اور لطف تو یہ ہے "قرآن جس معبود برحق کی خوشنودی کو مسلمانوں کی تمام عبادتوں اور بندگی کا محور قرار دیتا ہے وہ ہر ساعت اور ہر گھڑی مصروفِ عمل رہتا ہے۔ کل یوم ھو فی شان یعنی اللہ ہر لحظہ اپنی تخلیقی قوت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

اقبال کی نظر میں قرآن ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہر بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ یہ انفس (علمِ باطنی) اور آفاق (علمِ خارجی) دونوں سے بحث کرتا ہے۔ مسلم سائنس دانوں کو ہر دور میں غور و فکر کی پوری آزادی تھی۔ یہاں کسی گلیلیو کو زمین گول کہنے پر موت کی سزا نہیں سنائی گئی۔ "قرآن، بائیبل اور

سائینس" کے مصنف ماریس بوکانی اس حقیقت کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں۔ مسلمان جب تک قرآن کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے اقبال مندی کے پھر پرے ان کے سروں پر چمکتے رہے۔ اور مسلم سائینس دانوں کی ایجادات و برکات سے دنیا مستفید ہوئی۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ محض خالی خیالی باتیں ہیں۔ یورپ کا ایک محقق اسکاٹ (scott) اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ " عصر رواں کی تمام ایجادات و برکات عربوں ہی کے طفیل ہیں۔" وہ مزید کہتا ہے کہ " وہ یورپ جس پر اندھیرا چھایا ہوا تھا جابر بن حیان کے علم کیمیا الکندی اور ابن الہیثم کے علم بصریات، الرازی و ابن سینا کے علم طب، الخوارزمی اور الخیام کے علم ریاضی، البیرونی کے علم فلکیات، ابن رشد کے علم فلسفہ۔ ابن بطار کے علم نباتات، ابن الخطیب و طبری کے علم تاریخ سے آشنا ہو گیا۔"

مفکر نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ دنیا میں غیر مسلم اقوام اس وقت کامیاب ہوئے جب انہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا اور مسلمان اس وقت کامیاب ہوئے جب وہ دین اسلام کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہے۔ اقبال کہتا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اقبال قرآن کے ساتھ مسلمانوں کو جوڑنے کی جو بات کرتا ہے وہ اسی لئے تو

ہے کہ قرآن بار بار اہلِ ایمان کو تعقل، تدبر اور غور کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ آپ کو اس پر شرح صدر ہے کہ مسلمان قرانی تعلیم پر کاربند رہتے ہوئے ہر دور میں اپنی اجتماعی زندگی کو اس عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔

بندۂ مومن ز آیات خدا است
ہر جہاں ادر بر اوچوں قباست
چوں کہن گردو جہانے در برش
می دہد قرآن جہانے دیگرش

جو قوم ترقی اور تعمیر نو کی خواہش مند ہو اس کیلئے لازم ہے کہ اپنی فکر کی تطہیر کرے اور اپنے قلب و ذہن کو روایت پرستی، خرافات، جمود کورانہ تقلید، شخصیت پرستی، اوہام پرستی اور قدامت پرستی کی آلودگیوں سے صاف کرے۔ جو قوم تجدید اور اصلاح پر کان کھڑے کرتی ہے وہ کبھی بھی ترقی کی منزلیں پا نہیں سکتی، جو شخص بھی اقبال کی طرح اسلام کا کھلے ذہن سے مطالعہ کرے گا اس پر یہ حقیقت عیاں ہو گی کہ اسلام ایک انقلاب انگیز اور انقلاب آفریں ضابطۂ حیات ہے۔ یہ انسانی فکر کے ارتقاء کا حامی ہی نہیں تقیب بھی ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

بہر کیف قرآن کو اقبال کی زندگی سے الگ کر کے اقبال کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ ان کے کلام کی تاثیر اور سوز و گداز سب اسی سر چشمے کا فیضان ہے۔ افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ جب دوبارہ تخت نشیں ہوئے تو ہندوستان کی مقتدر علمی شخصیتوں

کو جن میں علامہ اقبال بھی شامل ہیں کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی تاکہ ملک میں تعلیمی اصلاحات کا خاکہ تیار کیا جاسکے۔ اقبال اپنے ساتھ قرآن مجید کا ایک نسخہ لے گئے۔ یہ نسخہ پیش کرتے ہوئے آپ نے شاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا

"اہل حق کی یہی دولت و ثروت ہے۔ اسی کے باطن میں حیات مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے اسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے۔"

ترقی اور کامیابی کیلئے جہاں عصر حاضر کے تقاضوں کے ساتھ مطابقت ضروری ہے۔ وہاں اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ عجمی تصوف اور وہ خانقاہی مزاج ہے جو افراد اور قوموں کی قوتوں کو مضمحل کر دیتا ہے اور انہیں زندگی سے گریز اور حقایق سے فرار سکھاتا ہے۔ اقبال کی نظر میں یہ چیز مرنے والی امتوں کا عالم پیری ہوا کرتی ہے۔ جمود و اضمحلال قوموں کی رگوں سے زندگی کی حرارت چھین لیتا ہے۔ اور انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جب مسلمانوں کا سیاسی زوال ہوا اور وہ شمشیر و سنان کھو بیٹھے تبھی تصوف اور رہبانیت کی تعلیم کو قبول حاصل ہوا۔ علامہ اس کا یوں بہترین انداز میں تجزیہ کرتے ہیں۔

"یہ حیرت کی بات نہیں کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطہ نظر بدل جاتا

ہے۔ان کے نزدیک ناتوانی حسین و جمیل شئے بن جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اسی ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی اور کاہلی اور اس شکست کو جوان کو تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنو کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا" (اقبال نامہ)

اقبال کی تیز نگاہ حجرۂ صوفی کے اس پرامن ماحول، اس کے حلقہ میں چھائے جمود، ذکر نیم شب اور مراقبے اور سرور کو دیکھ چکی تھی جو مسلمانوں کو اپنے حال اور مستقبل سے بے تعلق بنا کے خاک کی آغوش کی نذر کرتا ہے اور اسے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے اس سب پر تیشہ چلایا ہے۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبال مسلمانوں کو اللہ کی عظمت کے ڈنکے بجانے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کیلئے ابھارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مردانِ خود آگاہ و خدامست وہی لوگ ہیں جو

پوری دنیا کو نغمہ توحید سے معمور کریں۔ وہ تصوف کو "مذہبِ" "ملاو جمادات و نبادات"
قرار دیتا ہے۔

یہ حکمت ملکوتی یہ عالم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اقبال کہتا ہے کہ جس دین اسلام کی حقیقت احتساب کائنات ہے وہ بھلا اس جمود و اضمحلال اور صوفیت و ملائیت کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ یہ چیزیں تو ابلیس کو پسند ہیں، اس لئے اقبال "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں اس احتسابی اسپرٹ کو ختم کرنے کیلئے ابلیس کو اپنے مشیروں کو یہ مشورہ دیتے ہوئے سنتا ہے۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید

اقبال کو اس امر پر غیر متزلزل یقین تھا کہ اسلام ایک انقلابی اور ترقی پسند

تحریک ہے اور ہر زمان و مکان کیلئے قابل عمل نظام حیات ہے۔ لیکن صدیوں کے جمود و بے عملی نے اس کی حقیقت و صورت مسخ کر کے رکھدی ہے۔ اقبال اس پر زبردست تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ پچھلے پانچ سو سال سے اجتہاد کے دروازوں پر روایت پرستی کے بھاری بھر کم قفل چڑھائے گئے ہیں جس سے یہ غلط تاثر پیدا ہوا ہے کہ اسلام زمانے کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ چنانچہ اقبال کی فراست مومنانہ اس ضرورت کو سب سے زیادہ محسوس کرتی ہے کہ جدید انداز میں اسلام کو پیش کیا جائے۔ اور عالم انسانیت کے دلوں اور دماغوں کو اس کی ضیاپاشی سے منور کیا جائے۔ آپ کے وہ خطبات (خطبات مدارس) جو 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' The Reconstruction of Religious thought in Islam کے نام سے موسوم ہیں اسی مقصد کی تکمیل کی ایک کامیاب کوشش ہیں۔ اقبال کا یہ نظریہ کتنا فکر انگیز ہے۔ "تشکیل جدید" جیسے الفاظ کے استعمال سے ہی اس کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال حقیقی معنوں میں روحِ بلالی کا ترجمان تھا نہ کہ رسم اذان کا معتقد۔ یہی اکیسویں صدی میں اقبال کی فکری معنویت کا صحیح ادراک ہے اور یہی اس کی جوہری اہمیت ہے۔ اقبال کی نظر میں ہمارے لئے کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہوئے عصر حاضر کے علوم سے فیض حاصل کریں۔ اپنی دینی درسگاہوں میں بھی جدید علوم سکھانے کی طرف توجہ دیں اور فقہ اسلامی کی تشکیل و تدوین جدید طریقے سے کرائیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں وہ فرماتے ہیں۔

" The only course open to us is to approach modern knowledge

with a

respectful but independent attitutde and to appreciate the teach-

ings of Islam in the light of that knowledge even though we may be

led to differ from those who have bone before us"

تجدد پسندی کے سیلاب پر بند باندھنے کیلئے مفکر اسلام اقبال کہتا ہے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامی میں کہتے ہیں

"اگر ہم اسلامی فکر میں کوئی صحت مند اضافہ نہیں کر سکتے تو کم سے کم صحت تنقید سے عالم اسلامی میں امنڈتے ہوئے تجدد پسندی کے سیلاب کو ضرور روک سکتے ہیں۔"

"انفرادی اجتہاد کے مقابلے میں شورائی اجتہاد زیادہ بہتر ہے۔ دور جدید میں اجتہاد کی یہی شکل سب سے زیادہ موزوں ہو گی۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظام قانون کو بمودو تعطل سے نجات دلا کر اس میں زندگی یا نیا خون دوڑا سکتے ہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی کیلئے ایک تعلیمی اسکیم پیش کرتے ہوئے تدوین فقہ جدید کی ضرورت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ہمیں دیوبند اور لکھنو سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کرنے چاہیں جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں۔ چونکہ قانون محمدی سراسر تعمیر و تشکیل کا محتاج ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم انہیں اصول فقہ و قانون کی تعلیم دیں اور شاید اقتصادیات اور اجتماعات کی جامع تعلیم دین دینے کی بھی ضرورت پیش آئے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو ایل ایل بی بنائیں اور پھر ان سے کہا جائے کہ سیاسی نظریہ اسلامی اور اسلامی فقہ

کا ارتقاء وغیرہ مضامین کے لیکچروں میں شریک ہوں۔ بعض کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی بھی اجازت دی جائے۔ کچھ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کیلئے وقف کردیں۔ اس ملک میں قانون محمدیؐ جس طریق سے عمل میں لایا جاتا ہے وہ نہایت تاسف انگیز ہے اور بعض دشواریاں ایسی ہیں جو صرف مجلس قانون سازی کے قیام سے ہی دور ہو سکتی ہیں۔"

خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی۔

"علماء کی ایک جماعت قایم کی جائے جس میں ایسے مسلمان قانون دان بھی شامل ہوں جنہوں نے جدید علم قانون کی تعلیم حاصل کی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلام کے قانون کی حفاظت کی جائے اس کو پھیلا دیا جائے اور بشرطِ ضرورت اس کی از سر نو تشریح کی جائے۔ اس طرح سے کہ اس کے بنیادی اصولوں کی تہہ میں جو روح کار فرما ہے وہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔"

تہذیب نو پر کاری ضرب

اقبال ایک روائتی مشرقی شاعر نہ تھے۔ وہ ایک ایسے مفکر تھے جو مغربی فلسفے، مغربی علوم اور مغربی تہذیب و تمدن سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ جہاں فلسفے کے رازہائے سربستہ کھولنے کیلئے اور جدید ایجادات و اختراعات کیلئے مغرب کو سراہتے تھے اور مسلمان کو بھی اس میدان میں آگے بڑھنے کیلئے تحریک دیتے تھے، مگر ان پر

مغرب کی مرعوبیت قطعاً طاری نہ ہوئی۔ انہوں نے تہذیب مغرب کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اس کی تہہ میں چھپی آلودگیوں کو اس طرح بے نقاب کیا کہ ذوقِ لطیف اور ضمیر پاک والا ہر شخص اس پر نفریں کرنے لگا۔ انہوں نے تہذیب نو کا طلسم توڑ دیا اور اس کی بے حیائی و بے قیدی، الحاد اور فسادِ قلب و نظر کو سبوں کے سامنے عریاں کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان مغرب کی آغوش سے نکل کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہوتے گئے۔ بقولِ اقبال

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مغربی تہذیب کی زہرناکی پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبھوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لاتی ذلتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی ، ناشکیبائی، ہوسناکی

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

شفق نہیں مغربی افق پر
یہ جوئے خون ہے یہ جوئے خون ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ
کہ دوش امروز ہے فسانہ

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ
جہاں نو ہورہا ہے پیدا وہ عالم پیر مررہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنادیا ہے قمار خانہ

عظیم اسلامی مفکر سید ابو الاعلیٰ مودودی اقبال کی ان خدمات کو جو انہوں نے فرنگی تہذیب پر پیہم ضربیں لگانے اور مغربی مرعوبیت کے سحر کو توڑنے کیلئے انجام دیں، خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"سب سے اہم کام جو اقبال نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربیت اور مغربی مادہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگائی۔ اگرچہ یہ کام اس وقت علمائے دین او راہل مدارس اور خطیب حضرات بھی انجام دے رہے تھے مگر ان کی باتوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور کیا جاسکتا تھا کہ یہ لوگ مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لوگ ان اہل علم کی باتوں کو کچھ زیادہ وزن نہیں دیتے تھے۔ جو اگرچہ دین سے تو واقف تھے۔ مگر مغربی علوم، مغربی فلسفے، مغربی تہذیب

اور مغربی زندگی سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ان کے برعکس اقبال وہ شخص تھا جس کے متعلق کوئی بڑے سے بڑا جدید آدمی اٹھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ مغرب کو جانتا ہے اور اس سے زیادہ مغربی فلسفے اور مغربی علوم سے واقف ہے۔ اس لئے جب اقبال نے مغربیت، مغربی مادہ پرستی، مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر چوٹ لگائی تو مسلمانوں پر مغرب کی جو مرعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت کو توڑنے میں اکیلے اقبال کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے۔"

دین وسیاست کی تفریق پر تنقید

اقبال کے افکار کو آج اس لحاظ سے بھی دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے کہ دنیا بھر میں اسلامی تحاریک کے خلاف یہ مذموم پروپگنڈہ کیا جارہا ہے کہ یہ تحریکیں اسلام کے ہاتھ میں اقتدار دیکر "اسلامی شدت پسندی" کا مظاہر کرتی ہیں۔ سیکولر سیاست سے متاثر ہو کر مغرب زدہ مسلمان بھی مذہب کو زندگی کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ بھی "خدا کو خدا کا حصہ اور قیصر کو قیصر کا حصہ" دینے کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور جس طرح کوئی بھی نظام اپنے نفاذ کیلئے قوت اور اقتدار چاہتا ہے۔ اسلام بھی اپنی خوبیوں، برکتوں، رحمتوں اور محاسن کے ظہور کیلئے بلا شرکت غیرے اقتدار اور حکومت چاہتا ہے۔ ہر دوسرے نظام کی طرح دینِ اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ کہ اقتدار خلصاً اور مخلصاً میرا ہونا چاہئے اور ہر دوسرا نظریہ، نظام اور ایزم، (ism)

میرے مقابلے میں مغلوب ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ طے ہے جہاں اسلام کی کار فرمائی ہو گی وہاں نہ اشتراکی نظام ہو گا۔ نہ بادشاہی نظام ہو گا۔ نہ ڈکٹیٹر شپ چلے گی اور نہ لادین جمہوریت ہو گی۔ اور جہاں ان میں سے کوئی بھی نظام ہو وہاں دین اسلام نہ ہو گا۔ اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

"اسلام وحدت انسانی کو روح اور مادے کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادے، مذہب وسیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے"

(خطبات اقبال)

دین و سیاست کے باہمی رشتے پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ 'تشکیل جدید' میں فرماتے ہیں۔

"اصول توحید کو نوع انسانی کی ذہنی و جذباتی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا واحد عملی طریقہ اسلام بحیثیت ایک سیاسی نظام ہے۔ یہ خدا کی وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے نہ کہ تخت و تاج کی وفاداری کا اور چونکہ خدا زندگی کی حتمی روحانی بنیاد ہے اس لئے خدا سے اس کی وفاداری در حقیقت خود انسان کی مثالی فطرت سے وفاداری کے مترادف ہے۔

اقبال نے سیاست بے دین پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اسے چنگیزیت سے تعبیر کیا اور کہا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لیکن دوسری طرف دین بے سیاست کا نظریہ رکھنے والوں پر بھی نشتر چلائے۔ آپ نے کہا کہ اگر دین کے پاس اپنے عقیدے اور نظام کو نافذ کرنے کی قوت اور ہمت نہیں ہے تو خالی خولی باتوں اور وعظ کی مجلسیں منعقد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ طاقت جس کے پاس بھی ہو گی دنیا اسی کی طرف جھکے گی۔ کسی نظریہ کو قلب و ذہن اور قلم و قرطاس سے اٹھا کر ٹھوس زمین پر اتارنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر کوئی طاقت ہو۔ کلیمی کیلئے بہر حال عصا لازمی ہے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

دین و سیاست کی دوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کہ امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کی نامرادی
دوئی چشم تہذیب کیلئے نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

لادین سیاست کو کنیز اہرمن سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

حو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی

خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین
کنیز اہرمن دوں نہاد و مردہ ضمیر

اشتراکیت سے بیزاری

شروع میں اقبال کو روس کے اشتراکی نظام سے یہ امید بندھی کہ سرمایہ دارانہ نظام نے جس طرح غریب اور کمزور لوگوں اور اقوام کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا۔ بالشویک انقلاب ظلم و جبر کے اس ماحول سے نکال کر بنی نوع انسانی کے دکھوں کا مداوا کرنے میں کامیاب ہوگا اس لئے کہا۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئ گفتار
اندیشہ ہوا شوخئ افکار پر مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

لیکن اقبال کی چشم بینا کو جلد ہی معلوم ہوا ہر چمکیلی چیز سونا نہیں ہوتی۔ وہ جلد ہی اس نظریہ سے تائب ہوئے۔ اور اسے گمراہ کن قرار دیکر اپنا دامن اسے سے جھٹک لیا۔ اور مارکس کو، جسے وہ "کلیم بے تجلی" اور "مسیح بے صلیب" کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمایش ، مریز و کجدار کی نمایش

وہ اس حقیقت کو پا گئے کہ مزدوروں اور کاشت کاروں کے نام پر جو انقلاب آیا ہے اس میں بھی انسانیت کیلئے کوئی فلاح نہیں۔ یہ بھی فساد فی الارض کی دوسری شکل ہے۔ اس کی اساس مساوات شکم نہ کہ اخلاقی اقدار پر رکھی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

زمام کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است
غربیان گم کردہ اند افلاک را
در شکم جو یند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن بگیرد جانِ پاک
جذبہ تن کارے نہ دارد اشتراک
دین آن پیغمبر حق نا شناس
بر مساوات شکم دارد اساس

خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط مورخہ ۱۷، اکتوبر ۱۹۳۶ء میں آپ نے لکھا۔

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا،

جس کی تشریح میں نے اپنی تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور کے نام ۱۹۳۷ء میں اپنے خط میں آپ نے لکھا ہے

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ایزم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کیلئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔"

وطن پرستی۔ ہلاکت خیز فتنہ

اقبال اگرچہ آغاز میں وطنیت سے متاثر تھے مگر اپنے فکری ارتقاء کے سفر میں وہ جلد ہی اس سے بیزار ہوئے۔ انہوں نے اسے پوری انسانیت کیلئے تباہ کن اور ہلاکت خیز فتنہ قرار دیا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

انہوں نے "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے نظریہ کو دلائل اور شواہد

سے باطل اور خلاف استعمال قرار دیا۔ اسے تہذیب نوی کا تراشیدہ بت اور کاشانۂ نبوی کا غارت گر کہا۔ انہوں نے مسلمانوں کو وطنیت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے اور اسے زمین بوس کرنے کے لئے یوں پکارا

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گری کاشانۂ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھاوے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملادے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال کو وطنیت میں ملحدانہ مادہ پرستی کے بیج دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ حب الوطنی بالکل فطری چیز ہے مگر اصل اہمیت مسلمان کے دین و ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہے۔ ان ہی اقدار کیلئے ایک انسان کو زندہ رہنا چاہئے۔ نہ کہ زمین کے ایک ٹکڑے کیلئے۔ آپ نے فرمایا

"میں یورپ کی وطنیت کا مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ اگرچہ اسے ہندوستان میں نشو نما پانے کو موقعہ ملے تو مسلمانوں کو مادی فوائد کم پہنچیں گے۔ میری مخالفت تو اس بنا پر ہے کہ میں اس میں ملحدانہ مادہ پرستی کے بیج دیکھتا ہوں جو میرے نزدیک انسانیت کیلئے ایک عظیم

ترین خطرہ ہے۔ حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کیلئے پوری گنجایش ہے لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہے اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان اس کیلئے زندہ رہے اور ان ہی کے لئے مرے نہ کہ زمین کے اس ٹکڑے کیلئے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے" (حرفِ اقبال)

مولانا حسین احمد مدنی کے نام اپنے خط میں آپ نے کہا

"قدیم زمانے میں دین قومی تھا، مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا، مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ چونکہ دین پرائیویٹ عقائد کا نام ہے لہذا انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف ریاست ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی نہ انفرادی نہ پرائیویٹ بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد تمام فطری امتیازات کے باوجود عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے، ایسا دستور العمل صرف معتقدات پر مبنی ہو سکتا ہے۔ یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک امت کی تشکیل اور بقاء کیلئے ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ لادینی کی راہ ہو گی۔

اور شرف انسانی کے خلاف"۔۔۔۔اگر مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ تو لادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک انقلابی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔ مسلمانوں کی حقیقی اساس توحید اور ختم نبوت کے عقیدے پر ہے۔"

اقبال کی نظر میں مسلمان کو رنگ و نسل، وطن اور ملک اور علاقہ و زبان کے حدود کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زمان و مکان کی قیود سے متجاوز ہے۔ اس کا کوئی محدود وطن نہیں ہے بلکہ سارا جہاں اس کا ملک و وطن ہے۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اندلس (اسپین) میں طارق بن زیاد کی طرف سے واپسے کی کشتیاں جلانے کے واقعہ پر امت مسلمہ کو اسلامی قومیت کا یہ پیغام دیتے ہیں۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست

خندید و دست خویش بہ شمشیر بردو گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست

عظمت انسان کا ترجمان

انسان اپنے خالق کا شاہکار ہے۔ کسی خالق کی عظمت کا احساس اس کے شاہکار کی عظمت کے ادراک سے ہوتا ہے۔ اسی لئے اقبال چاہتے ہیں کہ انسان پوری طرح اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتے۔ تاکہ خدا کی حقیقت اور عظمت اس پر آشکارا ہو جائے۔ اسی زاویۂ نگاہ سے اقبال کے تصور خودی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ اسرار شہنشاہی سے واقف ہونے کیلئے آداب خود آگاہی چاہتا ہے

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

اقبال انسان کو بلندی کی اس سطح پر پہنچانا چاہتا ہے جہاں خالق اور مخلوق کے درمیان امتیاز کی تمام حد بندیاں مٹ سکیں اور انسان حقیقی معنوں میں زمین پر نیابت الٰہی کا عظیم ترین فریضہ انجام دے سکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے انسان کو "قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت" کی خدائی صفات منتقل ہوئی ہیں۔ یہاں سے ہی نگاہِ مومن کی ایک نظر سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ یہاں سے ہی خدا بندے سے پوچھتا ہے کہ "بتا تیری رضا کیا ہے" یہاں سے ہی مجسم شکل میں چلتا پھرتا قرآن نظر آتا ہے۔ حق یہ ہے اقبال انسان کی تخلیقی صلاحیتوں سے خدا کو پہنچاتا ہے۔ اس لئے کہ ان صلاحیتوں میں بھی خدا کا جلوہ ہے۔ اس کا کمال ہے۔ خدا تعالیٰ سے کہ کہنا کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

بھی دراصل خدا کی شان کبریائی کو خراج عقیدت ہے

حد یہ ہے کہ اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ انسان کا جنت سے نکالا جانا انسان کا نہیں بلکہ خود اللہ کا زیان ہے اس لئے کہ اب اسے (اللہ کو) طویل انتظار کرنا ہوگا۔ آخر انسان کوئی گری پڑی چیز نہیں ہے کہ جب چاہا نکال دیا اور جب چاہا بلالیا۔ آخر اس کی بھی تو خودی ہے۔ اس لئے وہ اس وقت تک جنت کا رخ نہ کریگا جب تک نہ اپنے ایمان و عمل سے خود کو اس کا اہل ثابت نہ کرے۔ اقبال شاعرانہ پیرائے میں کہتے ہیں۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا اِنتظار کر

غالبؔ تو کہتے تھے کہ مفت ہاتھ آئے تو کچھ بھی برا نہیں مگر اقبال کی طبیعت کو یہ گوارا نہیں وہ کہتے ہیں۔

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تیری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

انسان کو یہ رفعت کیوں حاصل ہوئی۔ اقبال اس کا جواب خود ہی دیتے ہیں جب وہ جبرئیل سے کہتے ہیں۔

نہ کر تقلید اے جبرئیل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر تسبیح و طواف اولیٰ

جبرئیل تو پھر جبرئیل ہے اقبال کی شوخیٔ گفتار کو خدا سے بھی یہ کہنے میں باک نہیں۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دیکر نہ لوں شان خداوندی

غرض یہ کہ یہی عشق و آرزو مندی، جو انسان کے سوا کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔ انسان کی عظمت اور اس کی خودی کا راز ہے۔ لیکن یاد رکھیے اقبال بے لگام خودی کا قائل نہیں۔ وہ شیطانی خودی کا قائل نہیں۔ بلکہ اس خودی کا سر رشتہ کلمہ توحید سے جوڑتا ہے۔

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

تقدیر ہے تدبیر تیری

اقبال کے افکار کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ انسان کو آبرو مندانہ طریقے سے زندگی بسر کرنے کا درس دیتا ہے۔ وہ بے بسوں، کمزوروں اور غلاموں کو ابھرنے اور لڑنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ کچلے ہوئے طبقوں کو اپنا حق منوانے کیلئے پکارتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ناتواں ہوتے ہوئے بھی کمزور اپنی ہستی، اپنے وجود اور اپنی انا کا ثبوت دے۔ وہ غلامی پر قناعت کرنا اور سامراج کی اجازت سے جینے کو انسان کی خودی اور غیرت کے منافی سمجھتا ہے۔ اقبال جہد للبقا (Struggle

(for existence اور عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا پیغام دیتا ہے۔ اس کی نظر میں کمزوری کا احساس لیکر فنا ہو جانے کے بجائے پوری قوت کے ساتھ لڑنا اور مارا جانا ہزار گنا بہتر ہے۔ اس تناظر میں اس کی سوچ غازیان اسلام اور مجاہدین صف شکن سے سو فیصدی مطابقت رکھتی ہے۔ وہ گیدڑ کی سو سالہ غلامانہ زندگی پر شیر کے ایک دن کی آبرو مندانہ زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی لئے وہ غلام اور محکوم قوموں کو احساس کمتری کا شکار ہونے کے بجائے عزم و یقین کے ساتھ آزادی کے حصول کیلئے سرگرم عمل اور نبرد آزما دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں۔

گرمؤ غلاموں کا ہور سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو

اقبال یقین محکم، عملِ پیہم اور محبت فاتح عالم کا مبلغ ہے۔ وہ عروج و زوال کیلئے افراد اور قوموں کو خود ذمہ دار سمجھتا ہے۔ وہ انسان کو تقدیر کے ہاتھ میں ایک کھلونا اور مجبور محض نہیں سمجھتا۔ جو لوگ تقدیر کے غلام بن کر بیٹھ گئے وہ اپنی زبوں حالی، لاچارگی، مظلومیت اور محکومیت کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہ خود کچھ کرنا نہیں چاہتے اور اپنی کوتاہ عملی، کم کوشی، سہل انگاری اور جمود و تعطل کیلئے سارا الزام تقدیر کے سر ڈال دیتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں "تقدیر ہے اک نام مکافات عمل کا"۔ انسان ہر وقت اپنے قلم سے اپنی تقدیر کی کہانی لکھ سکتا ہے۔

تو اپنی سرشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خانۂ حق نے جبیں تری

اقبال کہتے ہیں جس چیز کو ہم تقدیر کہتے ہیں۔ وہ انسانی عمل کے زیر اثر ذرا

سی دیر میں بدلتی رہتی ہے۔ تقدیر کے پابند نباتات و جمادات ہو سکتے ہیں۔ نہ کہ انسان جس کو ارادے اور عمل کی قوتیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیں۔ اس لئے مومن تقدیر سے بے نیاز ہو کر صرف احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خرسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اور احکام الٰہی کی صحیح تعبیر و تشریح اور بہترین عملی نمونہ پیغمبر اسلامؐ کی ذات بابرکات ہے۔ پروردگار عالم نے انہیں ہمارے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا۔ (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ) چنانچہ اقبال جوابِ شکوہ کے آخری بند میں، خدا کی زبان میں وہ پیغام حق دیتا ہے جسے بجا طور پر ہر عہد کے مسلمانوں کیلئے منشور قرار دیا جا سکتا ہے۔

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوائے اللہ کے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مناظرِ فطرت اور اقبالؔ

ڈاکٹر صورت جہاں

علامہ اقبال فطرت پسند شاعر تھے اور فطرت کے ذرے ذرے میں انہیں شانِ خداوندی نظر آتی تھی۔ فطرت کے مناظر اور مظاہر کے ساتھ اقبال نے اپنا رشتہ ذہنی طور پر اس قدر مستحکم کیا تھا کہ ان کے کلام میں ہزاروں مقامات پر فطرت اپنے جلوے دکھاتی اور اپنے مظاہر سے سکون و کیف کی حالت پیدا کرتی ہے۔ فطرت پسندی کے اسباب میں دراصل توحید وہ اہم سبب ہے جس کی رو سے ہر ذرہ، پتا، شجر ۔ حجر رات اور دن اللہ کی وحدانیت کے نغمے گاتے ہیں اور یہ اس ذاتِ عالی کے آثار ہیں جو ذات اقبال کے خیال میں "لم یزل" بھی ہے اور "لایزال" بھی۔ فطرت نگاری ایک بہت بڑا فن ہے اور اس فن کو علامہ اقبال نے اس قدر خوبی کے ساتھ برتا ہے کہ اقبال اردو کے چوٹی کے فطرت نگار شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

جب ہم اقبال کے کلام میں فطرت کی مصوری کی تلاش میں نکلتے ہیں تو بہار اور خزان میں فطرت کی جو بھی رنگینیاں دریاؤں، جھیلوں اور ندیوں میں جو بھی روانیاں اور سبزہ زاروں اور پھولوں میں جس قدر بوقلمونیاں موجود ہیں وہ چھن چھن کے ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ کبھی وہ بہار کے پورے کارواں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو دامن کہسار کو باغِ ارم سے مشابہ کرتے ہیں۔ رنگارنگ پھولوں کے

نام لیکر ہمارے سامنے رنگ و بو کی ایک مشکبار فضا سامنے لاتے ہیں۔ ندی نالے کا تذکرہ ہوتا ہے تو پانی کا اچھلنا، تڑپنا، سنبھلنا اور پیچ کھا کھا کر نکلنے کا منظر نہایت ہی دل پذیر پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ "ساقی نامہ" کے پہلے بند میں کیا ہے۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونین کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

اوپر جن پھولوں اور بہار کے قافلے کا نقشہ اقبال نے کھینچا ہے ایک دوسرے موقعے پر پھولوں کو سینکڑوں روپ اور ہزاروں پہلو دیکر مصوری اور فطرت نگاری کا کمال دکھاتے ہیں۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیر ہیں

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح

اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کو کرن

قدرت کے خوب صورت کارخانے کی متنوع اشیاء اور مناظر سے اقبال کی نظر لذت حاصل کرتی ہے۔ ان کے خیال میں فطرت کے اندر جلال اور جمال دونوں کیفیتیں موجود ہیں۔ چنانچہ علامہ کے نزدیک جس شئے میں جلالی شان نہیں وہ شئے نامکمل اور ناکارہ ہے۔ اقبال فطرت کی زبردست تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ مگر وہ فطرت پرستی کی طرف اپنے قاری کو نہیں لے جاتے ہیں۔ اقبال کا ذہن فطرت سے مسرت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ حیات اور کائنات کے اسرار و معارف کی تلاش کی طرف مائل کردیتا ہے۔ اقبال اپنے تخیل کی بلندی سے ایسی تشبیہیں اور صورتیں پیدا کرتے ہیں۔ جن کا جواب نہیں۔ مثال کے طور پر اس بند میں کیا سماں بندھ گیا ہے۔

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ تیرے رخسار پر

فطرت نگاری کے تعلق سے اقبال کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے فطرت اور آرٹ کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسے سمویا ہے کہ شاعری ساحر، معلوم ہوتی ہے۔ شاعر چاند کی پر سکوت خاموشی، درخت کی ٹہنیوں کی

خاموشی اور کہساروں کے سبزہ زاروں کی خاموشی کا منظر منظّم لفظوں کے لباس میں ایسے ڈھانپتے ہیں کہ فکر و فن حیرت کی انتہا کو چھو جاتی ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خاموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبزہ پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے

ان اشعار پر غور کرنے سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اقبال منظر کشی کرتے ہوئے ایک نیا باب کھول دیتے ہیں اور ایک نئی روائت کو آگے بڑھا دیتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد "مناظر فطرت اور اقبال" کے زیر عنوان مضمون میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کا مناظر فطرت کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے اور کئی پہلوؤں کا حامل ہے۔ یہ تعلق ایک عاشق اور معشوق کا تعلق بھی ہے۔ رقابت کا تعلق بھی ہے۔ اور فاتح و مفتوح کا تعلق بھی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کلام اقبال میں مناظر نگاری کی موجودگی منظر نگاری کیلئے نہیں ہے۔ منظر نگاری اقبال کے یہاں عظیم مقاصد کا کام دیتی ہے۔ اقبال کے کیفیات کے ابلاغ کیلئے آتی ہے اور اکثر و بیشتر اقبال کی تلاش و جستجو کیلئے ذریعہ بنتی ہے اور کسی بھی ایسی نظم

کا مطالعہ جس میں منظر نگاری سے لطف اندوز ہونے کیلئے نظم کی وقعت کو کم کرنے کے مترادف ہے لیکن اس کے باوجود اقبال کے کلام میں شعریات کے دوسرے پہلوؤں کی طرح اقبال کی منظر نگاری بھی ایک بڑی اہمیت کی حامل ہے"

شعر میں مناظر فطرت کی بھرپور عکاسی ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن ان کی مصوری اس سے بھی بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال کے یہاں یہ دونوں کارنامے ملتے ہین اور اس کے علاوہ جو خصوصیت اقبال کو دوسرے منظر نگار شعراء قلی قطب شاہ، نظیر، انیس، محمد حسین آزاد، سرور، جوش، اور حفیظ سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اقبال کی منظر نگاری میں واقعیت کے ساتھ ہی تخیل ایسا جادو جگاتی ہے، جس کی بدولت اقبال کے یہاں منظر نگاری کئی جہتوں کی حامل بن جاتی ہے۔

فطرت کے ساتھ گہرا انسلاک اقبال کے پورے کلام سے ظاہر ہے۔ لیکن اقبال کی فطرت پسندی، فطرت دوستی اور فطرت کے مظاہر میں گم گشتگی کا اصل زمانہ "بانگِ درا" کا زمانہ ہے۔ جس میں مناظر فطرت سے متعلق ان کی مصوری اور منظر کشی ماہرانہ شکل وصورت اختیار کر لیتی ہے۔

اقبال کے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات نے اردو شاعری کو نئی وسعتوں، نئی جہتوں اور نئی منزلوں سے آشنا کیا۔ ان کی اردو کتابوں میں جہاں ہمیں فکر و نظر کے گراں قدر جواہر پارے ملتے ہیں۔ وہاں ہم انگریزی، عربی، اور فارسی شاعری کی خزینوں سے ان کی گہری واقفیت کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کی زنبیل میں شیکسپیئر، ورڈس ورتھ۔ ٹینی سن، کولرج، گوئٹے، نیٹشے، برگسان،

مارکس، رومی، رازی، غزالی اور دیگر نابغات ماضی کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ وہ ان شخصیات سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ اور فیض کی ان شعاعوں سے اپنے کلام کو روشن کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون "اقبال کی فطرت نگاری" میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"اقبال کی نظر حسن فطرت سے لذت حاصل کرتی ہے۔ لیکن جو جمال اپنے اندر جلال کی شان نہیں رکھتا وہ ان کے نزدیک نامکمل ہے۔ دوسرے یہ کہ جمال و زیبائی کا ادراک اور احساس اسی صورت میں ہوتا ہے جب دیکھنے والے کی نظر جمال کی شعاعوں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اقبال فطرت نگار تو ہے لیکن فطرت پرست نہیں۔ ان کا ذہن حسنِ فطرت سے مسرت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے اسرار و رموز کے انکشاف اور جستجو کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔"

بانگ درا کے مطالعہ کے دوران ہم اقبال کی ترکیب بندی، اصطلاح سازی اور قادر الکلامی کے جابجا نمونے دیکھتے ہیں۔ مثلاً اقبال نے اس قسم کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ جن کا رشتہ بنیادی طور پر فارسی سے جڑ جاتا ہے۔ توسنِ ادراک، قتیل ذوق استفہام۔ قرب فراق آمیز، دختر خوش خرام، ابر، جوئے سرور آفرین، سیارۂ ثابت نما، مایہ دار اشک عنابی وغیرہ بانگ درا کی سلاست روانی، مصوری، منظر نگاری اور اعلیٰ فنکاری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے۔

"بانگ درا کی اکثر غزلوں اور نظموں میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال شعر اس وقت کہتے تھے جب ان کی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہوتی تھی۔ تصویرِ درد، ترانۂ ملی، شکوہ، جواب شکوہ۔ شمع و شاعر اور خضر راہ میں سلاست اور روانی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ بانگِ درا میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں۔ جن میں اقبال نے مناظر قدرت کی تصویریں کھینچی ہیں۔ چنانچہ ان کی قوتِ متخیلہ بہت بڑی ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس فن کے بہترین نمونے اپنی شاعری میں پیش کر دیتے ہیں۔ ہمالہ ابر کوہسار، انسان اور بزم قدرت ابر اور ایک شام، ان نظموں میں اقبال نے مصوری اور منظر کشی کا کمال دکھایا ہے۔"

بانگِ درا کی طویل نظموں میں "طلوع اسلام" کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ نظم امید اور مسرت کے جذبات سے مملو ہے۔ طلوع اسلام مین اقبال روشن مستقبل اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ نظم اگرچہ ان کے فلسفانہ اور مفکرانہ جلال و جمال کی آئینہ دار ہے۔ تاہم اس نظم میں فطرت کے رموز، اس کی انتہا اور رنگا رنگی کا کمال بھی دکھایا گیا ہے۔ شاعر سب سے پہلے ہماری توجہ شعر میں آسمان کے ان تاروں کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ جو صبح کے وقت تنک تاب یعنی کم چمکنے والے ہوتے ہیں اور ان کی یہ تنک تابی صبح روشن کی دلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ جب سورج مشرق سے نمودار ہوتا ہے تو گہری نیند میں سو جانے کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ بیداری شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی کا قافلہ روان دواں ہوتا ہے۔ شاعر

باغ کی بلبل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر پھول کے غنچوں میں گراں خوابی کا کچھ اثر موجود ہے۔ تو پھر اپنی آواز کو بڑھاتا کہ نغمہ کی خوبی صاف صاف سامنے آجائے۔ چنانچہ شاعر صحنِ چمن میں آشیاں میں اور شاخساروں میں حرکت و حرارت کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ یہ حرکت و حرارت دراصل اقبال ملت کی رگوں میں محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کیلئے اقبال نے فطرت کے مختلف پیکروں کا نام لیا ہے۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دررِ گراں خوابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
تڑپ صحن چمن، آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

اس نظم میں علامہ کا وہ شعر بھی شامل ہے۔ جس میں نرگس اپنی بے نوری پر ہزاروں سال سے اشکبار ہے اور پھر یہ کہ ایک چمن میں بڑی مشکل سے دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ جو نرگس کی اصلیت کو جان سکے اور اسے پہچان سکے۔ نظم کے دوسرے بند میں اقبال نے دو مشہور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک گل لالہ اور دوسرا نرگس۔

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کردے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کردے

طلوع اسلام میں اقبال نے حسن فطرت اور اس کے مظاہر و اجزاء کے تذکرہ و تحسین کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ نظم کا آغاز ہی صبح، روشن ستاروں کی تنک تابی، افق اور آفتاب سے ہوتا ہے۔ اقبال کی فطری نظموں میں

فطرت کے ان تمام خارجی مظاہر کا تذکرہ ملتا ہے۔ جن پر اقبال شیدا و فریفتہ ہیں مثلاً طوفان تلاطم ہائے دریا، لالہ ، دریا اور گہر، انجم۔ شاہین۔ عروسِ لالہ۔ پرواز وغیرہ یہ الفاظ اور تراکیب اقبال کے مخصوص علامتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اقبال نے ان کے ذریعے ایک طرف اپنا مافی الضمیر بڑی خوبی اور بلاغت کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔ اور دوسری فطرت کے حسن کو خراج عقیدت بھی پیش کیا اور اس طرح تحسین فطرت کے ذوق کو تسکین بہم پہنچائی۔ طلوعِ اسلام کا یہ پہلو کہ وہ فکر کے ساتھ ساتھ تحسین فطرت کے ذوق کی آبیاری بھی کرتے جاتے ہیں، اقبال کے رومانی طبع پر بھی دلالت کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری اور بالخصوص ان کی منظر نگاری میں جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال دل کی دنیا اور خارجی عالم میں بڑی فنکاری کے ساتھ رشتہ جوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنے فن کے اشارات کے ذریعہ فطرت کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ فطرت کی سرگوشیوں کو سنتا ہے۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو فطرت پر طاری کر دیتے ہیں۔ فطرت جو بات اکھڑے اکھڑے طور پر کہتی ہے اس کو وہ اپنے احساس کی گرمی اور توانائی سے موزوں طریقے سے بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جذب دروں سے حقیقت میں گہرائی پیدا کرتے ہیں اور جو کام فطرت سے نہ ہو سکا اس کی تکمیل فنکار کے ہاتھوں ہو جاتی ہے۔ شاعر اپنے دل سے کہتا ہے کہ تجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ کس شئے کی ہوس ہے۔ کیا تو نہیں جانتا ہے کہ قدرت اور قدرت کے مظاہر تیرے ہم نفس ہیں اور یہ ساری اشیاء اپنا تعلق تیرے ساتھ ساتھ قائم کرنا چاہتی ہیں۔

"تنہائی" کے عنوان سے اقبال نے ایک چھوٹی سے نظم لکھی ہے۔ جو صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں شاعر نے منظر نگاری کا وہ جادو جگایا ہے کہ جس کا جواب نہیں۔

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کی

یہ رفعتِ آسمان خاموش
خوابیدہ زمین جہاں خاموش

یہ چاند یہ دشت و دریا کہسار
فطرت ہے تمام نسترن راز

کس شئے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

فطرت کے جلووں کی رنگا رنگی اور رعنائی فنکار کے دل میں جب اپنا عکس اور اس کے خیالوں اور جذبوں میں حل ہو کر اظہار چاہتی ہے۔ تو اس وقت وہ اپنے وجود کی غرض و غایت کو پورا کرتی ہے۔ فطرت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اہل نظر کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ فطرت اس وقت تک حسن سے عاری رہتی ہے۔ جب تک کہ انسانی نظر اس میں جمال آفرینی نہ کرے۔ شفق کے منظر میں اس وقت دلکشی آتی ہے۔ جب کوئی صاحبِ منظر اس کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ کیا خوبصورت منظر ہے۔ اقبال نے فطرت، عالم وجود یا اپنے گرد و پیش کو اپنے ساتھ ایسے جوڑ دیا ہے کہ اس میں شوخیٔ فکر سے ایک نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ فطرت کے جلووں کی رنگا

رنگی اس کے دیدۂ بیدار کی رہینِ منت بنتی ہے۔

اقبال کی اردو اور فارسی شاعری میں متعدد مقامات پر ندی نالوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ذکر فقط پانی، اس کی لہروں اور اس کی روایتوں سے ضرور متعلق ہوتا ہے۔ مگر اقبال ہر مقام پر زندگی کی ابدی اور سرمدی حقیقتوں کے ساتھ ندی نالے کا رشتہ جوڑ دیتے ہیں۔

آتی ہے ندی مرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسمان کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کے چٹانوں پر ہوجاتا ہے چور

اشفاق حسین اقبال کی فطرت نگاری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں

"وہ فکرو تخیل سے فطرت کے دل آویز اور شوخ مرقعوں میں زندگی کی لہر دوڑاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ حسن کے نئے نئے اور دل فریب پیکر تخلیق کرتا ہے۔ گل کی تابانی، شعاعوں کا آنچل، عروس لالہ کا حسن، چشمہ کہسار۔ مہتاب کی کرن، برگِ گل پر شبنم کے گوہر اور بہتے ہوئے دریا کی روانی ادبی مصوری کے وہ تخیل ہیں، جس سے شاعری کا حسن بڑھتا ہے۔ شاعر تخلیقی عمل میں یہ تخیل دلکش بناکر پیش کرتا ہے۔ ادبی۔ مصوری، لطیف تصورات اور جذبہ تخیل کے احساسات سے پروان چڑھتی ہے اور جب شاعر آرٹ کے ذریعہ فطرت سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ تو شاعری ادبی مصوری کے روپ

میں ڈھل جاتی ہے۔ اقبال ادبی مصور اس لئے ہے کہ اس کا آرٹ
فطرت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔"

منظر نگاری کے دوران شاعروں نے سورج کا ذکر مختلف پیرائے میں کیا ہے۔ آفتاب کو روشنی اور گرمی کا منبع قرار دیا گیا ہے اور اس سے حاصل ہونے والی توانائی کو طاقت کا ایک بہت بڑا ذریعہ خیال کیا گیا ہے مگر اقبال آفتاب کو ایک دوسرے ہی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سورج کا وجود آسمان کیلئے باعثِ زیب و زینت ہے۔ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ ساری دنیا اس کی روشنی اور گرمی سے فیضیاب ہوتی ہے۔ لیکن اقبال اس روشنی کے خواہاں ہیں جس سے دل کی آنکھیں منور ہو جائیں۔ سورج انسان کی طرح مادی ضرورتوں اور تقاضوں میں گرفتار نہیں ہے اور وہ اس قدر بلندی پر چمک رہا ہے کہ دنیا کی بلندیاں اور پستیاں دونوں اس کیلئے برابر ہیں۔ اقبال یہی وسعت۔ بلندی اور رنگینی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی نظم " آفتاب صبح" میں شاعر منظر نگاری کرتے ہوئے آفتاب سے مخاطب ہے کہ اے آفتاب! اگر تو دنیا والوں کی مصیبت میں شریک نہیں ہے تو پھر تجھے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر تجھے اپنے کمالات کا شعور نہیں تو پھر تو انسان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کرتا۔ مجھ میں اور مجھ میں فرق صرف اتنا ہے کہ تو ذوقِ جستجو سے محروم ہے جبکہ میں حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔ اور اس کیلئے میں ہر وقت کوشاں رہتا ہوں۔ خواہ مجھے کامیابی ملے یا نہ ملے۔ " آفتاب صبح" کے چند بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے اقبال کی ابتدائی دور کی منظر نگاری اور اشیاء قدرت سے متعلق ان کے رویے کی نشاندہی ہوتی ہے۔

حسن تیرا جب ہوا بام فلک سے جلوہ گر
آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مئے کا اثر

نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر
کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر

ڈھونڈتی ہے جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہئے
چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلوہ چاہئے

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
نور سے جس کے ملے راز حقیقت کی خبر

اپنے حسن عالم آرا سے جو تو محرم نہیں
ہمسر یک ذرۂ خاک درِ آدم نہیں

"آفتاب صبح" کے متعلق سلام سندیلوی لکھتے ہیں

"اس نظم میں اقبال نے آفتاب کو زی روح تصور کیا ہے اور اس سے اس طرح بات کر رہے ہیں جس طرح ایک انسان دوسرے انسان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے"

شوخ آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے
زندگی پھر قید زنجیر تعلق میں رہے

زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کیلئے

آرزو ہے کچھ اسی چشم تماشا کے لئے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیاز ملت و آئین سے دل آزاد ہو

اس بند کے ذریعہ اقبال نے آفاقیت کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ سورج کی نظر میں زیر و بالا ایک ہیں وہ ہر جگہ یکساں چمکتا ہے اور ہر ملک میں اپنی روشنی پھیلاتا ہے۔ اسی طرح سے اقبال کی خواہش ہے کہ وہ امتیاز ملت و آئین کے پردے چاک کر ڈالیں اور ساری دنیا کی بہبودی کیلئے کوشش کریں۔ دراصل اقبال کے یہاں فطرت پرستی ایک ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا اصل مقصد اشیائے فطرت کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ بلکہ اشیائے فطرت کے مطالعہ کے بعد ان کے ذہن میں کچھ فلسفیانہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان ہی کے خیالات کی عکاسی کرنے کیلئے اقبال کسی منظر فطرت کا ذکر کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں فطرت کی کوئی حسین شئے کسی فلسفیانہ تجزئے کا وسیلہ بن جاتی ہے اور وہ ان روابط پر روشنی ڈالتے ہیں جو فطرت کی شئے اور انسان کے درمیان قائم ہو سکتے ہیں۔"

اس سے ہم یہ اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے نمونے پیش کر کے بنی نوع انسان کی توجہ مختلف چیزوں کی طرف مبذول کرائی ہے۔ انہوں نے فطرت کے کسی بھی پہلو کو نہ چھوڑا اور ہر پہلو میں فلسفیانہ نکتہ کا اظہار کیا۔ اقبال نے فطرت کی مختلف اشیاء کو مجسم کر کے ان سے گفتگو کی ہے اور بے جان چیزوں کو جاندار تصور کر کے زبان دی ہے۔ دراصل علامہ اقبال ساری عمر خدا کی ذات، اس کی صفات، اس کی کائنات اور کائنات سے متعلق

اشیاء اور مناظر پر غور کرتے رہے۔ اللہ نے اس دنیا میں جو چیزیں تخلیق کی ان چیزوں کے پسِ منظر میں اقبال کو قدرت کا جلال و جمال نظر آیا۔ وہ درختوں کے پتوں، ہری ہری شاخوں، گلاب کے مختلف رنگوں، پھولوں کی نکہتوں، پہاڑ کے اوپر سے بہنے والے ندی نالوں، دریا کی موجوں اور اس کے کناروں کی خاموشیوں چاند کی رنگینیوں اور سورج کی گرمیوں غرض کائنات کے تمام مظاہر سے نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ یہ سارے مظاہر اقبال کو اس عظیم الشان کاریگر کی عظمت کے نقش دل و دماغ پر ثبت کر دیتے ہیں۔ اقبال مناظر کی رنگا رنگی پر خود بھی سوچتے ہیں اور دوسروں کو بھی سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ حسنِ فطرت کو انسان اور انسانیت سے متعلق بصیرتوں کے ادراک کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اقبال مناظر کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مخلوقات کے بنانے والے خدا کی ذات اور اس ذات کی کرشمہ سازیوں کو سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اقبال اپنی شاعری کو انسانیت کی ترقی، انسانی قدروں کی آبیاری اور انسانی زندگی کے مسائل کی گرہ کشائی کیلئے بروئے کار لاتے ہیں۔ یہی اقبال کی فطرت نگاری کا امتیاز ہے۔

IQBALIAT

13

IQBAL INSTITUTE

UNIVERSITY OF KASHMIR
SRINAGAR.